کتاب و سنت اور اسلافِ اُمت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد

حیدرآباد

Volume:19 Issue:8 August 2026

مدیر

مولانا محمد عبدالقوی

ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

www.ashrafululoomhyd.com

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

اشرف الجرائد کی توسیع واشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ادارہ

درسِ قرآن



اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے

از: مولانا شیخ عبدالقادر فرید قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یَٰٓأَیُّہَا ٱلَّذِینَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّہَ وَکُونُوا۟ مَعَ ٱلصَّٰدِقِینَ (التوبہ:۱۱۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔

تشریح: صحبتوں کی تاثیر ہوتی ہے نیک صحبت اخلاق کے سنورنے، اعمال کی مضبوطی میں مددگار ہوتی ہے اس کے برخلاف صحبتِ بد اخلاق و اعمال کو بگاڑتی ہے بلکہ کبھی ایمان کی بربادی کا سبب بھی بن جاتی ہے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے ''کل مولود یولد علی الفطرہ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ'' ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے اس کے ماں باپ جس مذہب کے پیروکار ہوتے ہیں ان کی صحبت اور تعلیم سے متأثر ہوکر وہ بھی اپنے ماں باپ کے مذہب پر چلنے لگتا ہے۔ دیکھیں فطرت اسلام پر پیدا ہونے والا یہ بچہ صحبت کی تاثیر سے یہودی، نصرانی، مجوسی بن جاتا ہے، صحبت کا مؤثر ہونا اسی سے سمجھ میں آتا ہے۔

ایک آدمی کی سب سے زیادہ رفاقت اور صحبت اس کی اپنی بیوی سے ہوتی ہے، جو آدمی اپنے بیاہ کے لیے معیار انتخاب خوشنمائیوں اور رعنائیوں کو بناتا ہے عموماً ان کے آپس میں تلخیاں ہوتی ہیں یا پھر راہیں علٰحیدہ کرلی جاتی ہیں، اسی لیے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شوہروں کو حکم دیا کہ وہ اپنے لیے ایسی شریک حیات کا انتخاب کریں جس میں دین و اخلاق کا عنصر موجود ہو ''فاظفر بذات الدین تربت یداک'' (الحدیث) تم دین دار بیوی کو حاصل کرو تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔

اسلام نے بڑی تاکید سے بار بار اچھے لوگوں کے ساتھ رہنے اور ان کی ہم نشینی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور بد اخلاق و بدکردار لوگوں کی مجالس اور ان کی صحبت سے گریز کرنے کی تاکید کی ہے پھر دونوں کے انجام خیر

* ذمہ دار ادارہ حسیب المدارس، گھٹکیسر، حیدرآباد

وبد سے بھی آگاہ کیا ہے" یَا أَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوا اتَّقُوا اللہَ وَکُونُوا مَعَ الصَّادِقِینَ "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ سوال یہ ہے کہ سچے لوگ کون ہیں؟ جن کے ساتھ رہنے کا حکم مل رہا ہے جواب یہ کہ سچے وہ لوگ ہیں جو اپنے گفتار میں سچے، اپنے کردار و اعمال میں مخلص، اپنے معاملات ومعاہدات میں صاف ستھرے ہوں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے اپنے اوپر سچائی لازم کرلو کیونکہ سچائی نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور نیکی جنت کی طرف اور آدمی برابر سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے یہاں اس کو سچا لکھ دیا جاتا ہے، پھر روز محشر یوں کہا جائے گا ان کی سچائی نے اج ان کو فائدہ پہنچایا ہے"۔ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ "اور ایک جگہ پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لا تصاحب الا مؤمنا و لا تاکل طعامک الا تقیا "مؤمن کے علاوہ کسی کو اپنا دوست مت بناؤ کسی کی صحبت اور رفاقت اختیار کرنا ہو تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو یہ کسوٹی دی ہے جو ہمارا ہم جلیس ہو وہ صرف مومن ہو، مومن کسے کہتے ہیں؟ مومن کی نشانیاں پارے 18 کی ابتدائی آیات میں بتلائی گئی ہیں۔

ان آیات واحادیث سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خدا اور رسول کی نظر میں نیک صحبت کی کتنی اہمیت ہے؟ یہ اس لیے ہے کہ بری صحبتیں نہ صرف آدمی کے اخلاق کو ضائع کرتی ہیں بلکہ وہ غارت گر ایمان بھی ہوتی ہیں، دین ودنیا دونوں کو بگاڑنے والی ہوتی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مقولہ ہے: "لا تجالس اهل الاهواء فان مجالستهم ممرضة للقلب "نفس پرستوں کے ساتھ مت بیٹھا کرو کیونکہ ان کی ہم نشینی (روحانیت کو متاثر کرنے والی) قلب کو بیمار کرنے والی ہوتی ہے، بڑی محنت سے دل میں نور ایمان اور نور اعمال پیدا ہوتا ہے اور روحانیت پاکیزہ ہوتی ہے لیکن صحبت بد کی تاثیر سے بندہ دھیرے دھیرے عبادات میں اخلاقیات میں زوال پذیر ہوتا چلا جاتا ہے، اسی لیے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو بہت پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا "المرأ علی دین خلیله فلینظر احد کم من یخالل "کہ آدمی اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے لہذا تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اس بات پر غور وفکر کر لے کہ وہ کس کو دوست بنا رہا ہے۔

اللہ پاک ہم سب کو نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے اور ان سے محبت کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین



درسِ حدیث

میری اطاعت کرنے والا جنت میں جائے گا

از: مولانا مفتی محمد احمد علی قاسمی*

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال: كُلُّ اُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰی قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللهِ! فَمَنْ يَأْبٰی؟ قَالَ: مَنْ اَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ اَبٰی (بخاری شریف: 7280)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے سارے لوگ جنت میں جائیں گے، سوائے ان کے جنہوں نے انکار کیا، (یعنی جنت میں وہ داخل نہ ہوسکیں گے) صحابہؓ نے عرض کیا، وہ کون شخص ہے جو انکار کرے؟ فرمایا: جس نے میری اطاعت کی، وہ جنت میں داخل ہوگیا، اور جس نے میری نافرمانی کی، گویا اس نے انکار کیا۔

تشریح:۔اسلامی عقیدہ کے حوالہ سے ہر مسلمان اس حقیقتِ واقعیہ سے بہ خوبی واقف ہے؛ بلکہ صدقِ دل سے تسلیم بھی کرتا ہے کہ سید الکونین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک ہستی اور مقدس شخصیت من جانب اللہ مفترض الطاعہ (یعنی وہ ذاتِ عالی جس کی اطاعت وفرماں برداری بہ غیر کسی قید وشرط کے لازمی طور پر فرض قرار دی گئی) ہے، جن کا کہا ماننا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری ہی کا ایک حصہ ہے، من يطع الرسول فقد اطاع الله (النساء:۸۰) یعنی جو رسول کی اطاعت کرے اُس نے اللہ کی اطاعت کی ۔آیتِ شریفہ کا اسلوب مقامِ نبوت کو کس قدر لطیف پیراۂ بیان میں آشکارہ کر رہا ہے کہ رسول کی حیثیت و صداقت اتنی مسلّم یقینی اور واقعی ہے کہ اس کے ہر قول وفعل کی اتباع اور اطاعت وہ دراصل اطاعتِ خداوندی ہے، اور اس سے اعراض وانکار باعثِ خسران وبربادی ہے۔

اس حقیقت کو تسلیم کر لینے اور مان لینے کے بعد یہ بات بھی بداهۃً سمجھ میں آجائے گی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایات وفرامین حیاتِ انسانی کے تمام پہلوؤں کو جامع ہیں، زندگی کی ہر میدان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

---

* استاذ حدیث وفقہ ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

ایسی تعلیمات وسنن موجود ہیں جس سے کسی درجے میں بھی ردّوقدح اور کمی بیشی کی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے؛ تبھی جا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہستیِ مبارکہ امتِ مسلمہ کے لیے ''اسوۂ حسنہ'' کا مقام رکھتی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۲۱) یعنی حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے، ایسی مبارک اور برمحل تعلیمات وہدایات کے مل جانے کے بعد امتی کا فریضہ بنتا ہے کہ اس سرمایۂ ہدایت کی کماحقہ قدردانی کرے، اور قدردانی یہی ہے کہ اُن پر پوری دیانت داری کے ساتھ عمل پیرا ہو، زندگی کی تاریک راستوں میں سُننِ نبوی کا چراغ روشن رکھے، اور اسی کی روشنی میں چلتے ہوئے زندگی بسر کردے؛ کہ یہی سلامتی اور فلاح وکامیابی کا واحد راستہ ہے۔

زیرِ نظر حدیث شریف میں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہی نصیحت فرمارہے ہیں؛ کہ میری اُمتِ اجابت (جنہوں نے اللہ کو تسلیم کیا، میری نبوت پر ایمان لائے، اور دعوتِ حق پر لبیک کہا) سب کے سب جنت میں داخل ہوں گے، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے انکار سے کام لیا، (یعنی اطاعتِ رسول کو ترک کیا، اور اطاعت و فرمانبرداری کے بجائے کبر واستکبار کا معاملہ کیا) عرض کیا گیا: یارسول اللہ! کون انکار کرے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جس نے میری اطاعت فرمانبرداری کا فریضہ نبھایا، وہ جنت میں داخل ہوگیا، اور جس نے میرے احکام سے صرفِ نظر کیا، اس نے میرا انکار کیا، یعنی اس نے خود اپنے آپ کو تسلیم وتعمیل سے روک کر نجات کا راستہ چھوڑا، اور اپنے گناہوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے دخولِ جنت کے اسباب سے دور رہا؛ اس طرح وہ اطاعتِ رسول سے صراحۃً ولساناً نہ سہی صورتاً وعملاً گویا انکار کا ارتکاب کیا۔ اسی سے یہ حقیقت بھی شاید سمجھی جاسکتی ہے کہ اطاعتِ رسول کے مقابلے میں مسلسل مخالفتِ رسول انسان کو انکار وتکذیب تک بھی لے جاسکتی ہے، **العیاذ باللہ**

حدیث کے آخری جملے (**و من عصانی فقد ابیٰ**) کو توجہ اور دھیان دے کر بار بار پڑھنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کیا فرمارہے ہیں؛ کیا کوئی امتی اپنے آپ کو منکرین کے زمرہ میں شامل کرسکتا ہے؟ ظاہرسی بات ہے کہ کوئی ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی اس بات کے سوچنے کی جرآت نہیں کرسکتا، جب بات ایسی ہی ہے تو پھر اطاعت وفرمابرداری کے جذبات میں کمزور کیوں رہیں؟، اس لئے ہمت کر کے اپنی زندگی کے ہر لمحے میں اسوۂ نبوی کو سامنے رکھ کر اطاعت وفرمانبرداری کا فریضہ ادا کرتے رہنا چاہیے، احیاناً معصیت کا صدور الگ چیز ہے، اُس کا حل فی الفور توبہ واستغفار ہے، اخلاص کے ساتھ اِس عمل کی برکت سے اس کے اثراتِ بد سے حفاظت رہے گی ،اس طرح بفضلِ خداوندی دخولِ جنت کا ثمرہ بھی نصیب ہوگا ، انشاءاللہ۔ آمین

پیش گفتار

دوسرے دینی اداروں اور تحریکوں کے بارے میں ہمارا طرز عمل[1]

از: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ*

صورت حال یہ ہے کہ جہاں ہمارے رفقائے کار دعوت اصلاح وتبلیغ کا کام کرتے ہیں وہاں پہلے سے کچھ دینی ادارے موجود ہوتے ہیں اور اکثر جگہ کوئی دینی تحریک بھی ہوتی ہے لہذا ہمارے لیے غور وفکر کرنے اور ایک اصول طے کر لینے کی ضرورت ہے کہ ہمارا رویہ عام دینی اداروں اور تحریکوں کے ساتھ کیا ہو؟۔

سب سے پہلے ایک اصول بیان کیا جاتا ہے جس سے ایسے مواقع پر ہمیں رہنمائی حاصل ہوگی اور وہ ایک مستقل معیار کا کام دے گی جس سے ہم اپنا طرز عمل اور رویہ معین کر سکیں گے۔

دین کا جو حصہ ہم تک پہنچا ہے اس کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں، ایک تو وہ حصہ ہے جو اپنی خاص ہیئت وشکل کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے اور اس کی وہی ہیئت وشکل مطلوب ہے۔ اس کو ہم منصوص بالوضع (جس کی کوئی شکل خود شریعت نے متعین فرمادی) کہہ سکتے ہیں، دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ دینی امور ہیں جو اپنی خاص ہیئت وصورت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہیں مثلاً ارکان دین اور بہت سے ایسے فرائض جن کو نہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے بتایا بلکہ ان کی شکلیں زبانی بھی بتائیں اور خود کر کے بھی دکھلائیں مثلاً نماز، حج، وضو وغیرہ۔

---

[1] مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کا وہ مضمون جو نصف صدی گذرنے کے بعد بھی دینی تنظیموں کے لئے اسی طرح مشعلِ راہ ہے جو تحریر کے وقت تھا، اس لئے اشرف الجرائد کے اداریے کے ذریعے ناظرین کے لئے بہ طور قند مکرر پیش کیا جارہا ہے۔ مدیر

دین کا دوسرا حصہ وہ ہے کہ اس میں نفس شئ مطلوب ہے لیکن بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کی بنا پر (زمانہ کی تعریف اور راحت کے لیے وسعت اور سہولت کا خیال کر کے) آپ نے ان کی شکلیں متعین نہیں کیں، صرف شے بتلادی کہ یہ مقصود ہے، یہ چیزیں منصوص ہیں لیکن ان کی کوئی خاص وضع (شکل وصورت) منصوص نہیں مثلاً جہاد فی سبیل اللہ، دعوت الی اللہ، علم و دین کے سلسلہ کو چلانا اور احکام شرعیہ کا امت تک پہنچانا، یہ سب امت سے مطلوب ہے اگر امت ان کو چھوڑ دے اور بالکل ترک کر دے تو وہ گنہ گار ہوگی۔

مگر صرف یہ اعمال مقصود ہیں ان کی کوئی خاص شکل اور طریقہ معین نہیں کیا گیا، جو مطلوب ہو) بلکہ اس بارے میں امت کی عقل پر اعتماد کیا گیا ہے اور ان فرائض کی ادائیگی کو اس کی صلاحیتوں پر چھوڑ دیا گیا ہے مثلاً دعوت منصوص ہے لیکن اس کی کوئی خاص ہیئت منصوص نہیں۔

غیر منصوص بالوضع (جس کی شریعت نے کوئی شکل متعین نہیں فرمائی) کی واضح مثال لباس کا مسئلہ ہے لباس نہ ہوتو کوئی لباسی ساتر ہو ٹخنوں سے اونچا ہو گھٹنوں سے نیچا ہو، تفاخر اور تکبر کا لباس نہ ہو کوئی حرام و ناجائز مثلاً مردوں کے لیے ریشم نہ ہو، پس لباس بھی منصوص اور اس کی یہ شرائط بھی منصوص ہیں لیکن لباس کی شکل لباس کا رنگ اور اس کی قطع وغیرہ، غیر منصوص ہیں اس میں امت کے لیے بہت سی سہولتیں ہیں اس کو امت کی تمیز اور عقل عام پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

دوسری مثال مساجد کی ہے، مساجد بھی مطلوب ہیں اور مساجد کی نظامت بھی مطلوب ہے کہ ان میں ذکرُ اللہ ہو اور وہ دوسرے مقامات سے ممتاز ہوں مگر ان کا کوئی خاص طریقہ مطلوب نہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ عالمِ اسلام میں مساجد مختلف وضع (شکل وصورت کی پائی جاتی ہیں، یہاں تک کہ مینارے مساجد کے لیے شرط نہیں تھے، ہندوستان کی مسجدوں میں دو میناروں کا رواج ہے الجزائر و مراکش کی مساجد میں ایک مینار ہوتا ہے اور دنیا کی سب سے بڑی اور پہلی مسجد بیت اللہ کا کوئی مینار نہیں۔

اب دعوت الی اللہ کی مثال لیجیے، اللہ کی طرف بندوں کو بلانا فرض ہے، انفرادی ہو یا اجتماعی، تقریر سے ہو یا تحریر سے، علانیہ ہو یا خلوت میں اس میں کوئی شکل معین نہیں، نوح علیہ السلام کی زبان سے قرآن پاک میں واضح کر دیا گیا کہ دعوت کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلاً ونهاراً. حضرت نوح علیہ السلام نے (حق تعالیٰ کی بارگاہ میں کہا کہ اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کے سامنے رات میں بھی دین کی اور توحید کی دعوت رکھی اور دن میں بھی ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَاراً پھر میں نے خوب پکار کر اور چیخ کر بھی ان کو بلایا ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَاراً پھر میں نے باعلان بھی آپ کا پیغام ان کو پہنچایا اور چھپ

چھپ کر تنہائیوں میں بھی ان سے آپ کی بات کہی، لہٰذا دعوت دین کا کام کرنے والے ہر فرد و جماعت کو اختیار ہے کہ وہ اپنے لیے جو طریقہ صحیح جانے وہ مقرر کرے اور اپنی تحریک کا جو طرز مناسب سمجھے وہ اختیار کرے، اس میں کسی کو جائز اور ناجائز لکھنے یا کوئی روک ٹوک لگانے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس وقت عام طور پر دین کے ان دونوں حصوں کو خلط ملط کیا جاتا ہے، منصوص کو غیر منصوص کا درجہ دیا جاتا ہے اور غیر منصوص کو منصوص کے مقام پر پہنچا دیا جاتا ہے اس کے نتیجہ میں مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں، اور مختلف اداروں اور تحریکوں میں اکثر تنازعہ کی شکل پیدا ہوگئی، اگر ہم ان چیزوں میں فرق سمجھ لیں تو بہت سی مشکلات حل ہوجائیں گی۔ سینکڑوں تنازعوں کا سد باب ہوجائے گا، اور بہت سی ذہنی الجھنیں ختم ہوجائیں گی۔

چیزوں کی اصلی ہیئت سمجھنے اور ان کو ان کے صحیح مقام پر رکھنے کا یہ پیمانہ ہمارے ہاتھ آگیا اس کے بعد صحیح اصول پر چلنے والی اور مخلصانہ دینی تحریکوں، دینی اداروں کے درمیان تقابل، تصادم اور اختلاف کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا، فرق جو رہ جاتا ہے وہ صرف اپنے تجربوں اور حالات کے مطالعہ کا ہے کہ کام کی کونسی شکل اور طریقہ زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ہے۔ اور کس سے وہ نتائج ومقاصد ظاہر ہوتے ہیں جو اس کام سے مطلوب ہیں دعوت الی اللہ کی شکل اور طرز میں ہر جماعت اور ادارہ آزاد ہو، اس کو کسی خاص شکل یا طرز پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے، جیسے کسی کو اپنے تجربہ اور مطالعہ کا پابند نہیں کیا جاسکتا ہے کوئی جماعت اگر کسی خاص طریقہ کار کو اختیار کرتی ہے، (بشرطیکہ وہ دین کے اصول وآداب کے مخالف نہ ہوں) تو وہ اپنے فیصلہ میں حق بجانب ہے، ہم اپنے مخصوص طرز کار کو بہتر اور احیاء دین کے لیے مفید سمجھتے ہیں تو یہ اپنی جگہ ٹھیک ہے، ہم اپنے طرز کار کو دوسری تحریکوں اور اداروں کے داعیوں کے سامنے بہتر طریقہ سے پیش کرسکتے ہیں لیکن اگر صرف طرز کار کے فرق کی وجہ سے ہم ان کو غلط کار اور کسی گناہ کا مرتکب سمجھیں تو ہم غلطی پر ہیں ہم صرف اتنا کرسکتے ہیں کہ ان سے دوبارہ غور کرنے اور نتائج کو دیکھنے اور ان کا موازنہ کرنے کی درخواست کریں، لیکن ان کے ساتھ ایک گمراہ فرقہ کا سا معاملہ کرنا، ان کو جاہل اور گمراہ سمجھنا غلط اور لغو ہے۔

ہماری اس دینی تحریک ''دعوت اصلاح وتبلیغ'' کا ایک خاص طرز ہے، اس میں تبلیغی گشت ہے، اجتماعات ہیں، ذکر اللہ پر، اکرام مسلم پر اور ترک لایعنی پر زور ہے، اور دین کے لیے گھر سے نکلنے اور وقت اور عادات و مالوفات کی قربانی کی ترغیب ہے وغیرہ وغیرہ، ان میں بعض چیزیں وہ ہیں جن کی ہمیں شریعت نے سختی کے ساتھ تاکید کی ہے، مثلاً اکرام مسلم، ذکر اللہ کی کثرت، ترک مالا یعنی وغیرہ، لیکن بعض چیزیں مثلاً گشت، اجتماعات وغیرہ ہیں جو انتظامی امور ہیں، یہ حدیث وقرآن سے استنباط کئے جاسکتے ہیں جو اصولی طور سے صحابہ کرامؓ کی

زندگی میں ملیں گی لیکن خاص اس ہیئت میں نہیں ملیں گی، یہ سب چیزیں اجتماعی اور تجربی ہیں، ان چیزوں پر یا ان خاص شکلوں پر ہر جگہ اور ہر شخص سے منصوص چیزوں کی طرح اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

سب سے مشکل چیز اعتدال ہے، انبیاء علیہم السلام میں اعتدال بدرجہ اتم ہوتا ہے، ہم صاف کہتے ہیں کہ یہ بالکل امکان ہے کہ پچیس برس کے بعد اللہ کے کچھ بندے پیدا ہوں جو صاحب نظر بھی ہوں اور اللہ کے ساتھ ان کا تعلق ہو اور ہمارے اس طریقہ میں زمانہ کی ضرورت اور تقاضے کے لحاظ سے تبدیلیاں کریں اس وقت اگر ایک جامد طبقہ اس کی مخالفت ہمارا نام لے کر محض اس بنا پر کرے کہ ہمارے بزرگ ایسا کرتے تھے، تو اس کا رویہ غلط ہوگا اس کا اصرار ہٹ دھرمی ہوگا کبھی کبھی ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری اس تحریک میں بھی ایک طبقہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ یہی طریقہ کار اور یہی طرز دین کی خدمت اور احیاء کے لیے ہمیشہ کے لیے اور ہر جگہ کے لیے اور ہر شخص کے لیے ضروری ہے اور اس کے علاوہ سب غلط ہے، جب تک اس مخصوص طریقہ پر تقریر نہ ہو اسی خاص ڈھنگ پر انہی ساری پابندیوں پر گشت نہ ہو اور اجتماعات میں مقررہ طریقہ سے دعوت نہ دی جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ساری جدوجہد رائیگاں گئی اور جو کچھ ہوا سب فضول ہوا، یہ بے اعتدالی ہے اور یہ رویہ خطرناک ہے، اس لیے کہ اسی طرز عمل کی وجہ سے مختلف مذاہب اور فرقے امت میں پیدا ہوئے ہیں، اصل حقیقت صرف اتنی ہے کہ اب تک غور اور تجربوں نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے کہ ہر تقریر کے بعد جہد وعمل کی دعوت ضرور دی جائے، ہر بستی میں ایک مرکزی اجتماع ضرور ہو، رات کو مساجد میں قیام ہو وغیرہ وغیرہ، پس جب تک یہ چیزیں فائدہ مند معلوم ہوتی ہیں، ہمیں اس وقت تک ان کو جاری رکھنا چاہیے لیکن اگر ہفتہ کا اجتماع ہمارے شہر لکھنو کی نوچندی جمعرات کی طرح ایک رسم بن جائے، رات کا قیام رت جگا کی طرح رسمی ہو جائے اور دین کے کام کے لیے چلنا ایک رسم بن جائے تو یہ ایک مذہب بن جائے گا اور ایک بدعت قائم ہو جائے گی، اور اس وقت کے ربانی مصلحین کا فرض ہوگا کہ ان کے خلاف جدوجہد کریں اور ان رسومات کو مٹائیں، بہت سی چیزیں صحیح مقاصد اور دینی مصلحتوں سے شروع ہوتی ہیں، لیکن آگے چل کر غلط صورت اختیار کر لیتی ہیں، ایسے موقع پر حقیقت و رسم، سنت و بدعت، فرض و مباح میں تمیز کرنا تفقہ فی الدین ہے، اور کہنے والے نے کہا ہے۔ گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

اگر ہماری تحریک کی ہم عصر دینی تحریکیں یا ادارے منصوص چیزوں کو مقصد بنائے ہوئے اور اپنی مخلصانہ صوابدید کے مطابق کسی طرز پر کام کر رہے ہیں تو ہمارا ان سے کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہمیں ان کے کام کا اعتراف کرنا چاہیے، ان کو کامیابی کی دعائیں دینی چاہئیں، اور ان سے تعلقات بڑھانا چاہیے، اسی لیے کہ وہ دین کے بعض اہم شعبوں کو سنبھالے ہوئے ہیں اور اسی طرح انھوں نے ہم کو یہ موقع دیا ہے کہ ہم ان دوسرے

کاموں سے مطمئن ہوکر اپنا کام کریں، حضرت مولانا الیاسؒ مدارس کے لیے دعائیں کرتے تھے اور اپنے خاص محبین کو ان کی اعانت کرنے کی طرف توجہ دلاتے تھے، بہت سے مدارس کی آمدنیاں اس تبلیغی تحریک کی وجہ سے بڑھ گئیں تھیں، مولانا اپنے اہلِ تعلق کو اس کی طرف بھی متوجہ کرتے تھے کہ علماء کی ملاقات کے لیے جایا جائے اور ان سے تعلقات بڑھائے جائیں اور ان کے حقوق (اکرام ومحبت اور تعاون) ادا کئے جائیں۔

یہاں ایک باریک بات سمجھ لیں وہ یہ ہے کہ ایک نبی ہوتا ہے اور ایک مجدد اور ایک مصلح ہوتا ہے، نبی کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقے کے اتباع کے بغیر نجات ہی نہیں ہوسکتی، اور اس کی ہدایت حاصل کئے بغیر اللہ کی رضا اور کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی، اس میں کسی قسم کی مدارات یا تساہل کی گنجائش نہیں ہے لیکن مجددین اور مصلحین کا معاملہ یہ نہیں ہے، ہر مجدد اور ہر ربانی مصلح کے طریقے کی پیروی سے دین کو اور دین کے طالبوں کو نفع پہنچتا ہے مثلاً کسی مجدد کے طریقے سے قربانی کے جذبات بڑھتے ہیں لہٰذا اس کے طریقے کی پیروی سے قربانی کے جذبات بڑھیں گے اور ایک دوسرے مجدد کے طریقے سے انفاق فی سبیل اللہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں لہٰذا اس کے اثر سے انفاق وایثار کے جذبات پیدا ہوں گے، ایک دوسرے مجدد کے طریقہ سے مثلاً صفائی معاملات میں پختگی آتی ہے تو صفائی معاملات کے سلسلہ میں اس سے تعلق اور استفادہ خاص طور پر مؤثر ہوگا۔

بہر حال نبی کے طریقہ پر تو نجات کا انحصار ہوتا ہے اور بالکل اسی طریقہ پر چلنا لازم ہوتا ہے، لیکن کسی مجدد اور مصلح کا معاملہ یہ نہیں ہے، خاص خاص ترقیاں تو ان کے اتباع اور ان کے ساتھ وابستگی سے ہوتی ہیں لیکن نجات اس پر منحصر نہیں ہوتی، ایک بات یہ بھی ہونی چاہئے کہ امت میں طبقات کا اتنا اختلاف ہے، اذہان کا اتنا تفاوت ہے اور حالات ایسے مختلف ہیں کہ کوئی تحریک یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ وہ تمام طبقات کو متاثر کرسکتی ہے اور ان کی تسکین کا سامان کرسکتی ہے، اور ان کی استعداد کے مطابق دینی غذا فراہم کرسکتی ہے، کوئی ذہن تقریر سے متاثر ہوتا ہے، کسی پر لٹریچر اثر انداز ہوتا ہے اور کوئی کسی دوسرے ذریعہ سے متاثر کیا جاسکتا ہے، اسی طرح ایک واحد طریقہ کار سے ہر جگہ ہر ماحول میں اور ہر حالت میں کامیابی مشکل ہے، اس حقیقت کو سمجھنے اور اس کے مطابق چلنے میں لوگوں سے بڑی غلطیاں ہوتی ہیں، بہت سے لوگ قابل قدر اور بڑے مخلص ہیں لیکن ان لوگوں کا اس وقت تک دل خوش نہیں ہوتا جب تک کہ ہر شخص انھیں کے مخصوص طرز پر کام نہ کرے اور سب ایک ہی کام نہ کرنے لگیں، حالانکہ عمومی وانقلابی تحریکوں کا معاملہ یہ نہیں ہوتا، وہاں ہر چیز اس کے صحیح مقام پر رکھی جاتی ہے اور ٹھیک چوکھٹے پر بٹھائی جاتی ہے، ہر شخص سے وہی کام لیا جاتا ہے جس کا وہ زیادہ اہل ہے اور اس میں وہ دوسروں

سے ممتاز ہے، اور جس کو وہ دوسروں کے مقابلہ میں بہتر طریقہ پر انجام دے سکتا ہے۔

ہم کو تو دوسری دینی کوششوں اور ان کے ذمہ داروں کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے بہت سے لوگوں کو سنبھال رکھا ہے جو ہماری گرفت میں نہیں آسکتے تھے یہ اللہ کی طرف سے انتظام سمجھنا چاہئے کہ کچھ لوگ اس راستہ سے دین تک آجائیں اور کچھ اُس راستہ سے آجائیں اور اپنے طریقہ کار کو مناسب طریقے سے ان کے سامنے اکثر و بیشتر پیش کرتے رہنا چاہئے لیکن اس طرح نہیں کہ وہ سمجھیں کہ یہ ہمارے درپے ہیں اور ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں، نہ ان کے سامنے آپ اپنی دینداری کا اظہار کریں، چہ جائیکہ سب کی خدمات اور ان کے قابل قدر ثمرات کا انکار کر دیا جائے بلکہ ان کو بھی اپنی تحریک کے نتائج ہونے کا دعویٰ کرنے لگیں) اس طرح آپس کے تنازعات ختم ہو جائیں گے، ایک دوسرے کی طرف سے دل صاف ہو جائیں گے اور امت کے مختلف طبقات اور جماعتوں میں تعاون علی البر والتقویٰ کرنے کی یعنی خدا ترسی پر ایک دوسرے کی امداد کی استعداد پیدا ہو جائے گی جو عرصہ سے مفقود ہو چکی ہے، اور جس کی اس زمانہ میں (جبکہ باطل مختلف شکلوں اور حربوں کے ساتھ حملہ آور اور اہل باطل ''مِنۡ كُلِّ حَدَبٍ يَّنۡسِلُوۡنَ'' ہر ٹیلے اور ٹاپو سے ابلے چلے آرہے ہیں کا مصداق ہیں) سخت ضرورت ہے۔

مصلح کے معمولات دیکھنا غلطی ہے

حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا:

آج کل بعض طالبین مصلح کے اعمال کی کمی زیادتی کو دیکھتے ہیں، جو سخت غلطی ہے۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے، جیسے کوئی مریض طبیب کے معمولات دیکھے کہ یہ تو خود ہی ایک روٹی کھاتا ہے، اور ہم کو کہتا ہے کہ چار پانچ کھایا کرو۔ کوئی اس کو دیکھنے لگے کہ طبیب پہلوان بھی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو بد اعتقاد ہو جائے۔ بھائی! تم کو اس سے کیا بحث کہ وہ تندرست ہے یا بیمار۔ وہ پہلوان ہے یا کمزور ۔تم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ جو مرض تمہارے اندر ہے وہ اس کا علاج کر سکتا ہے یا نہیں؟ اگر کر سکتا ہے تو علاج کراؤ ورنہ چلتے بنو۔ جو تمہارا علاج کر سکے وہاں جاؤ۔

(منتخب ملفوظات: ۲۸۸)

گوشۂ سیرت

ابو القاسم (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی بات مان لو!

از: مرتب*

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا، وہ بیمار ہو گیا تو آپ اس کی بیمار پرسی کے سے تشریف لے گئے دیکھا کہ اس کا باپ اس کے سرہانے بیٹھا ہوا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس لڑکے کو اسلام کی دعوت دی، وہ اپنے والد کی طرف دیکھنے لگا، (یعنی اس نے اجازت طلبی کی نظر سے اپنے والد کو دیکھا، اُسے اپنے باپ کا ڈر اور خوف اسلام قبول کرنے میں مانع بن رہا تھا) اس نے کہا بیٹا! ابو القاسم (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا کہا مان لو! چناں چہ وہ لڑکا مشرف بہ اسلام ہوا اور کلمۂ شہادت پڑھا ''اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ الله'' میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ (بخاری:1356)

نسائی شریف کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وہاں سے واپس آئے اور یہ فرما رہے تھے کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس لڑکے کو جہنم سے بچا لیا۔

فوائد: آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اہل ایمان کی بیمار پُرسی کے لئے تشریف لے جاتے ہی تھے کہ یہ حقوقِ مسلم میں سے ہے، لیکن مذکورہ واقعۂ سیرت سے معلوم ہو رہا ہے کہ جو اہل تعلق ہیں خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو آپ ان کی عیادت کے لئے بھی تشریف لے جاتے۔

دین کی دعوت پہنچانے اور امت کو جہنم سے بچانے کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی اور کوئی موقعہ دعوتِ اسلام کا ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔

حسنِ معاشرت سے امت کے قلوب میں اسلام کی محبت وعظمت پیدا فرما دیتے اور حسنِ اخلاق و کردار سے بے دین کو بھی مائل بہ اسلام فرما دیتے تھے۔ اور وہ دامنِ اسلام میں آ کر ہمیشہ کے خُسران سے محفوظ و مامون ہو جاتا۔ اور حصولِ مقصود پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا قلب تشکر و امتنان کے جذبات سے معمور ہو جاتا۔

---

* استاذ ادارہ اشرف العلوم حیدر آباد

گوشۂ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

حضرت خُلیدہ بنت قیسؓ

(زوجہ محترمہ حضرت براء ابن معرور رضی اللہ عنہ)

از: مولانا مفتی رفیع حنیف صاحب قاسمی*

نام ونسب:

حضرت خلیدہ بنت قیس جلیل القدر صحابیہ ہیں، ان کا نسب اس طرح ہے: خُلیدہ بنت قیس بن ثابت بن خالد بن اشجع، قبیلہ دہمان سے تعلق رکھتی تھیں۔

نکاح:

ان کا نکاح ایک صحابیِ رسول حضرت براء بن معرور انصاریؓ سے ہوا، جو قبیلہ خزرج کے خاندان بنوسلمہ کے رئیس تھے۔ ان کے صلب سے ایک صاحبزادے بشر بن معرور رضی اللہ عنہ اور بیٹی سلافہ رضی اللہ عنہا تولد ہوئیں اور شرفِ صحابیت بھی پایا، ان کے شوہر حضرت براء بن معرورؓ کو (۱۳ بعد بعثت) بیعت عقبہ میں اپنی بیٹی سلافہؓ کے ساتھ شرکت کا موقع ملا، حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ کا انتقال ہجرت نبوی سے صرف ایک سال قبل ہوا۔ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد ان کے فرزند حضرت بشر رضی اللہ عنہ کو باپ کی جگہ خاندان بنوسلمہ کا سردار نقیب مقرر کیا۔

قبول اسلام

یہ ان صحابیات میں شامل ہیں جو ہجرت نبوی سے قبل ہی اپنے شوہر کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئیں۔

بیٹے کی شہادت اور صبر واستقامت

حضرت خلیدہ بنت قیسؓ ان صحابیات میں سے ہیں جنہیں دین اسلام قبول کرنے پر مصائب وحالات

* استاذ فقہ وادب: ادارہ کہف الایمان ٹرسٹ، بورہ بنڈہ، حیدرآباد

سے دو چار ہونا پڑا، تمام پریشانیوں کو دین پر استقامت اور ثبات کے لیے برداشت کیا، جبین استقلال پر ذرہ برابر شکن نہ لائیں اور تادم واپسیں اسلام پر قائم و دائم رہیں۔

فرزندِ ارجمند بشر بن براء رضی اللہ غزوۂ خیبر میں شامل تھے، فتح خیبر کے بعد یہ افسوناک حادثہ پیش آیا کہ خیبر کے ایک یہودی رہنما سلام بن مشکم کی بیوی زینب بنت حارث نے ایک بکری پکا کر خدمت نبوی میں بطور ہدیہ پیش کیا، بکری زہر آلود تھی، یہ سوچ کر کہ اگر یہ نبی برحق ہیں تو گوشت نہیں کھائیں اور چکھ کر چھوڑ دیں گے اور گوشت کھالیا تو نعوذ باللہ ان کا خاتمہ ہو جائے گا۔

آپ نے اس گوشت کا ٹکڑا چکھ کر تھوک دیا، لیکن حضرت بشر بن براء رضی اللہ عنہ نے لقمہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا اور سے حلق سے نیچے اتار دیا، اسی وقت وفات ہوگئی، رسول اللہ ﷺ کو ان کی اولاد سے اتنا تعلق تھا کہ ان کی زندگی کا خاتمہ رفاقت نبوی میں ہوا، حضرت بشرؓ کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ یہ گوشت زہر آلود ہے، اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے تھوکنا سوء ادب سمجھا اور اپنی جان دے دی۔

خدمتِ نبوی میں حاضری

اللہ کے رسول اللہ کی خدمت کی حاضر باش تھی، ان سے کئی ایک روایات منقول ہیں: ایک روایت میں مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا، اے اللہ کے رسول! کیا مردے ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: تمہارے ہاتھ خاک آلود ہوں! (یا فرمایا: تمہاری پیشانی خاک آلود ہو!) پاکیزہ روحیں جنت میں سبز رنگ کے پرندوں کی شکل میں ہوتی ہیں۔ اگر پرندے درختوں کی شاخوں پر ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں تو روحیں بھی ایک دوسرے کو ضرور پہچانتی ہیں۔

(الطبقات الکبری لابن سعد، خلیدہ بنت قیس: ۸/ ۲۴۱، دار الکتب العلمیہ، بیروت)۔

اور ایک روایت میں ہے: وہ کہتی ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے صحابہؓ سے یہ فرماتے ہوئے سنا: کیا میں تمہیں لوگوں میں سے سب سے بہترین شخص کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہؓ نے عرض کیا: کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول! راویہ کہتی ہیں کہ آپ نے اپنے ہاتھ سے مغرب (مشرق و مغرب یا سرحدوں) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: وہ شخص جو اپنے گھوڑے کی باگ ڈور تھامے ہوئے ہے، اور اس انتظار میں ہے کہ دشمن پر حملہ کرے یا دشمن اس پر حملہ کرے۔ پھر فرمایا: کیا میں تمہیں اس کے بعد بہترین شخص کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہؓ نے عرض کیا: کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول! آپ نے اپنے ہاتھ سے حجاز کی طرف اشارہ کیا اور

فرمایا: وہ شخص جو اپنی بکریوں کے ریوڑ میں تنہا رہتا ہے، نماز قائم کرتا ہے، زکوٰۃ ادا کرتا ہے، اور اپنے مال میں اللہ کا حق جانتا ہے۔ اس نے لوگوں کے شر اور برائیوں سے خود کو الگ تھلگ کرلیا ہے" **فقال: رجل فی غنمه یقیم الصلاۃ ویؤتی الزکاۃ، ویعلم حق اللہ علیه فی ماله، قد اعتزل شرور الناس۔**

(الطبقات الکبریٰ لابن سعد، خلیدہ بنت قیس: ۸/۲۴۱، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

وصال نبوی اور خلیدہ بنت قیسؓ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی، وہ کہتی ہیں: ام بشر بن البراء بن معرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اس بیماری کے دوران آئیں جس میں آپ کا وصال ہوا۔ آپ کو شدید بخار تھا۔ انہوں نے آپ کو چھوا تو عرض کیا: میں نے آپ جتنی شدید حرارت اور بخار کسی اور میں نہیں دیکھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس طرح ہمارے لیے اجر و ثواب دگنا کیا جاتا ہے، اسی طرح ہم پر بلا اور آزمائش بھی دگنی کی جاتی ہے۔ لوگ اس بیماری کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں؟ انہوں نے کہا: میں نے عرض کیا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ذات الجنب (پھیپھڑوں یا پسلیوں کی بیماری) ہوئی ہے، اس پر آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس بیماری کو مجھ پر مسلط نہیں کرسکتا، یہ تو شیطان کی طرف سے ایک چبھن کی مانند ہے۔ لیکن یہ اس زہریلے کھانے کا اثر ہے جو ـــــ میں نے اور تمہارے بیٹے نے خیبر کے دن کھایا تھا ـــــ وقتاً فوقتاً مجھ پر ظاہر ہوتا رہا، یہاں تک کہ اب میری رگِ جان (ابہر) کے کٹنے کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہادت کی موت سرفراز ہوئے۔ **"ما زال یصیبنی منها عداد حتی کان هذا، وآن انقطاع ابهری، فمات رسول اللہ صلی اللہ علیه وآله وسلم شهیدا"۔**

(الطبقات الکبریٰ لابن سعد، خلیدہ بنت قیس: ۸/۲۴۱، دار الکتب العلمیہ، بیروت)۔

وفات

حضرت خلیدۃ بنت قیسؓ کے مزید حالات تاریخ میں نہیں ملتے۔

اصلاحی مضامین

اسوۂ نبوی اور ہماری زندگی

از: مولانا انصار اللہ قاسمی *

زندگی اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے، اس نعمت کی حفاظت اور قدر دانی صرف یہی نہیں ہے، ''حفظانِ صحت'' کے اصولوں اور ضابطوں کا پورا پورا اہتمام کیا جائے، سختی سے ان کی پابندی کی جائے بلکہ زندگی کی اصل قدر دانی یہ ہے کہ یہ ''الٰہی اصولوں'' اور ''خدائی ضابطوں'' کے مطابق گزاری جائے، زندگی پوری اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری اور اُس کی اطاعت وفرمانبرداری میں بسر ہو، زندگی گزارنے کے ان ''خدائی ضابطوں'' کو زبانی طور پر بھی اور عملی طور پر بھی سمجھانے اور بتانے کے لئے انبیاء کرام کی تشریف آوری ہوئی، انبیاء کرام نے اپنی آسمانی تعلیمات اور ہدایات میں زندگی کے تمام پہلوؤں اور گوشوں کا احاطہ کیا، افکار ونظریات سے لے کر خیالات و جذبات، احساسات اور نفسیات تمام چیزوں کو خدائی تعلیمات کا پابند بنایا ہے، زندگی کے تمام نشیب وفراز، خوشی، غمی، امیری، فقیری، تندرستی، بیماری، دوستی، دشمنی، غصہ و ناراضگی، ہمدردی وغم خواری، غرض یہ کہ زندگی کے تمام مراحل میں انسان کو اپنے پروردگار اور پالنہار کی رضاء وخوشنودی کا پابند کیا، اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ تمہارے لیے زندگی گزارنے کا بہترین اسوہ اور نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی میں ہے، (الاحزاب: ۲۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی ہیں اور نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چوں کہ تا قیامت پوری انسانیت کے لیے باقی اور کافی ہے، اس لیے ضروری تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مبارکہ زندگی کے ہر گوشہ اور پہلو سے کامل اور مکمل ہو، تا کہ دنیا میں جہاں کہیں انسان رہتے اور بستے ہیں ان سب کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات لائق تقلید اور قابل عمل بن سکے، سیرت طیبہ کا تعلق لکھنے پڑھنے اور سننے سنانے سے زیادہ ہماری عملی زندگی سے ہے کہ ہم نے کہاں تک اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی زندگی میں برتا اور اپنایا ہے؟ ایک مسلمان زندگی کے کسی پہلو پر جب کچھ سوچتا ہے یا کسی شعبہ میں قدم رکھتا ہے تو سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ اس بارے میں اسوہ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہے؟ پھر وہ اپنا قدم آگے بڑھاتا ہے اور یہی حقیقت ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی زندگی کا بہترین آئیڈیل اور نمونہ ماننے کی۔

* آرگنائزر مجلس تحفظ ختم نبوت ٹرسٹ تلنگانہ وآندھرا پردیش واستاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

یوں تو سیرت مبارکہ کے بہت سے گوشے اور پہلو ہمارے لیے مشعل راہ ہیں، تاہم غصہ اور ناراضگی، یہ بھی انسانی زندگی کا ایک پہلو ہے، اس پہلو کے لحاظ سے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس بارے میں اسوۂ نبوی کیا ہے اور نبی ناراضگی اور غصہ کا اظہار کب فرماتے تھے؟ حضرت حسن بن علیؓ اپنے والد حضرت علیؓ کے حوالہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ما رأيتُه منتصِراً في مَظْلَمَةٍ ظَلَمَهَا قَطُّ مَا لَمْ يَنْتَهِكْ مِنْ مَحَارِمِ اللهِ تَعَالَى شَيْئٌ فإذا انْتُهِكَ من محارمِ اللهِ كَانَ مِنْ أَشَدِّهِمْ غَضْباً (شمائل ترمذی) اس روایت میں فرمایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اوپر زیادتی کا کبھی بدلہ نہیں لیا، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ امور کی پامالی ہونے لگے، جب اللہ کے حکموں کی پامالی ہوئی تو آپ سب سے زیادہ غضبناک اور ناراض ہوتے اس روایت کو سامنے رکھتے ہوئے دو مثالوں پر غور کیجئے۔

پہلی مثال یہ کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک غزوہ سے واپسی کے دوران ببول کے درخت کے سایہ میں آرام فرمانے کے مقصد سے لیٹ گئے، ایک مشرک نے دیکھا کہ آپ تنہا آرام فرما رہے ہیں، وہ اپنا بُرا ارادہ (قتل) لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب آیا اور ببول کے درخت سے لگی آپ کی تلوار نکال لی، اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیدار ہو گئے، مشرک نے پوچھا: اے محمد! بتاؤ آج تم کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ من يَمْنعُكَ مِنى ؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پورے اطمینان وسکون کے ساتھ فرمایا: "اللہ" اس لفظ کو سنتے ہی وہ تھر تھر کانپنے اور لرزنے لگا، تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلوار ہاتھ میں لے کر پوچھا بتا! اب تجھ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ مشرک نے جواب دیا: آپ مہربان ہیں، معاف کرنے والے ہیں، اس پر آپ نے اس کو معاف کر دیا اور چھوڑ دیا۔

(ریاض الصالحین، ص: ۵۱ باب فی الیقین والتوکل)

دوسری مثال یہ کہ ایک مرتبہ مکہ میں اونچے اور اعلیٰ خاندان کی خاتون فاطمہ بنت اسد چوری کے الزام میں گرفتار ہوئیں اور سب ہی کو معلوم تھا کہ اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، قبیلہ کے ذمہ داروں نے سوچا چوری کے جرم میں خاتون کا ہاتھ تو کیا کٹے گا مگر خاندان کی ناک ضرور کٹ جائے گی اور مکہ میں ہماری نیک نامی اور عزت وجاہت خاک میں مل جائے گی، پھر ان لوگوں نے خاتون کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہیتے غلام حضرت اسامہؓ کو سفارش کے لیے تیار کیا، حضرت اسامہؓ نے آپ کی خدمت میں جب سفارش کی بات رکھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ انور سرخ ہو گیا اور آپ نے شدید ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''اسامہ! کیا تم اللہ کے حدود کے بارے میں مجھ سے سفارش چاہتے ہو؟ پھر آپ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا: اے لوگو! تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہو گئے کہ اگر ان میں کا

طاقتور مالدار شخص جرم کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور اگر کوئی غریب کمزور جرم کرتا تو اس کو سزا دیتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ خدا کی قسم! اگر چوری کرنے والی خاتون فاطمہ بنت اسد کے بجائے فاطمہ بنت محمد بھی ہوتی تو میں اس پر بھی سزا نافذ کرتا۔‘‘

(ریاض الصالحین: ۲۱۷ باب تحریم الشفاعۃ فی الحدود)

سیرت مبارکہ کی یہ دو مثالیں ہیں، جن میں غصہ و ناراضگی کا موقع ومحل واضح ہے، وہ یہ کہ اگر اپنی ذات یا حیثیت تک کوئی ناگواری، تکلیف یا ایذا رسانی کی بات ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کو برداشت کر لیتے اور اس کا انتقام و بدلہ نہیں لیتے، البتہ دین وشریعت کی پامالی، بے حرمتی یا بے احترامی کی اگر بات ہوتی تو آپ کو ذرہ برابر برداشت وگوارہ نہیں ہوتا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ذرا بھی رعایت نہیں فرماتے۔

یہاں رُک کر ہمیں اپنی حالت اور طبیعت کا جائزہ لینا چاہیے اور اپنا احتساب کرنا چاہیے کہ ہم نے دین وشریعت کے معاملہ میں اس اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنی زندگی میں کہاں تک اپنایا ہے؟؟ اپنا ذات پر کوئی حرف آئے یا اپنے مقام ومرتبہ پر کوئی آنچ آئے تو ہم مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں اور اگر ہماری نگاہوں اور نظروں کے سامنے اسلامی تعلیمات اور احکامات کی پامالی و بے حرمتی ہو تو ہم خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں، بچہ اگر کسی دن ٹیوشن ناغہ کر دے تو اس کی تنبیہ کی جاتی ہے، اسکول کا ہوم ورک کسی دن نہ کرنے پر ڈانٹ ڈپٹ ہوتی ہے، شرارت کرنے پر بعض دفعہ مار پیٹ ہوتی ہے قیمتی زیور یا ذاتی استعمال کی چیز کے ٹوٹ جانے یا گم ہونے پر غم و غصہ اور ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے لیکن کیا کبھی بھول کر اور انجانے میں ہی سہی، ایسا بھی ہوا کہ بچہ یا ماتحت فرد کے نماز نہ پڑھنے پر تنبیہ کی گئی، کسی دن قرآن مجید کی تلاوت نہ کرنے پر ڈانٹ پڑی ہو، نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت کی خلاف ورزی پر غم وغصہ کا اظہار ہوا ہو، معاشرہ اور سماج میں تو شرعی احکام کی پامالی ہو ہی رہی ہے، مگر خود اپنے گھروں سے بھی تو اسلامی تعلیمات کا جنازہ نکلا جا رہا ہے، ہم ہی اس کو کاندھا دیتے ہیں اور بعض دفعہ ’’جلوس جنازہ‘‘ کے امیر اور قائد بھی ہم ہوتے ہیں، مگر کانوں پر جوں نہیں رینگتی اور یوں سمجھتے ہیں کہ ناک پر مکھی بیٹھی اور اڑ گئی۔

اسوۂ نبوی کا پیغام یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی اس کے مطابق ڈھالیں اور سنواریں، خدا کرے یہ پیغام ہمارے دل کے دروازہ پر دستک دے اور بجائے اس کے کہ طبیعت ہماری شریعت بن جائے ماضی قریب کے خدا مست بزرگ ومجاہد مولانا رشید احمد گنگوہی کے بقول شریعت ہماری طبیعت بن جائے۔ آمین

اصلاحی مضامین

نکاح میں تاخیر... لڑکیوں کے ساتھ ناروا سلوک

از، محمد شاہد ناصری حنفی*

انسانی تاریخ میں بعض ظلم ایسے ہوتے ہیں جن پر شور بہت مچتا ہے، اور بعض ظلم ایسے ہوتے ہیں جو خاموشی سے ہوتے رہتے ہیں۔ نہ کوئی عدالت قائم ہوتی ہے، نہ کوئی مقدمہ درج ہوتا ہے، نہ کسی اخبار کی سرخی بنتے ہیں، لیکن ان کے زخم پوری زندگی رستے رہتے ہیں۔ بروقت نکاح سے محروم کر دینا بھی انہی خاموش مظالم میں سے ایک ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے ملک کے مختلف شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں دعوتی واصلاحی اسفار کے دوران ایک بات بار بار سننے کو ملی۔ جب نکاح، عفت، خاندان اور اسلامی معاشرت پر گفتگو ختم ہوتی ہے تو مجمع منتشر ہونے سے پہلے چند چہرے خاموشی سے قریب آتے ہیں۔ کوئی باپ آنکھوں میں نمی لیے کہتا ہے: " حضرت! میری بیٹی کی عمر نکل گئی، ہم نے بہت انتظار کیا، اب اچھے رشتے نہیں آتے۔" کوئی ماں آہ بھر کر کہتی ہے: " ہم نے بہتر کی امید میں کئی رشتے واپس کر دیے، آج وہی فیصلہ ہمارے لیے وبال بن گیا۔" کوئی جوان لڑکی حسرت سے کہتی ہے: " کاش! میری بات وقت پر مان لی جاتی۔" اور کبھی کوئی بھائی سر جھکا کر اعتراف کرتا ہے: " ہم نے اپنی بہن کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔" یہ چند واقعات نہیں، بلکہ ہمارے معاشرے کے ایک ایسے اجتماعی المیے کی جھلک ہیں جو خاموشی کے ساتھ پھیلتا جا رہا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ نکاح میں تاخیر کا ذکر آتے ہی ہم فوراً ایک فریق کو قصوروار اور دوسرے کو مظلوم قرار دے دیتے ہیں، حالانکہ حقیقت اس سے کہیں زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہے۔ کہیں لڑکے والے ظلم کرتے ہیں، کہیں لڑکی والے۔ کہیں دولت رکاوٹ بنتی ہے، کہیں انا۔ کہیں جھوٹی عزت آڑے آتی ہے، کہیں بے جا محبت، اور کہیں محض ناسمجھی ایک پوری زندگی کو انتظار کی نذر کر دیتی ہے۔

اسلام نے نکاح کو آسان رکھا تا کہ معاشرہ پاکیزگی، عفت اور سکون سے آباد رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین، اخلاق اور حسنِ کردار کو رشتے کی بنیاد بنایا، لیکن افسوس کہ وقت کے ساتھ ہماری ترجیحات بدلتی گئیں۔ سادگی کی جگہ نمود و نمائش نے لے لی، کردار کی جگہ ظاہری معیار آ گئے، اور سنت کی جگہ رسم و رواج نے قبضہ جما لیا۔

* ایڈیٹر ماہنامہ مکہ میگزین ممبئی

نتیجہ یہ نکلا کہ جس نکاح کو آسان ہونا چاہیے تھا، وہ خود ہمارے ہاتھوں دشوار ہوتا چلا گیا۔ اس مضمون کا مقصد کسی ایک طبقے کو ہدف بنانا نہیں، نہ کسی پر الزام رکھنا ہے، بلکہ ان اسباب کا منصفانہ جائزہ لینا ہے جنہوں نے ہمارے معاشرے میں نکاح کو غیر ضروری طور پر مشکل بنا دیا ہے۔ کیونکہ اصلاح کا راستہ الزام تراشی سے نہیں، بلکہ اپنے حصے کی ذمہ داری قبول کرنے سے کھلتا ہے۔ اسی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ ہم ان اسباب کا ایک ایک کر کے جائزہ لیں جو بظاہر معمولی دکھائی دیتے ہیں، لیکن عملاً بہت سی بیٹیوں کی زندگیوں میں تاخیر، بے یقینی اور محرومی کا سبب بن جاتے ہیں۔

اگر انصاف کی نگاہ سے دیکھا جائے تو نکاح میں تاخیر کا ہر واقعہ یکساں نہیں ہوتا۔ بہت سے والدین ایسے ہیں جو اپنی بیٹیوں کی بروقت شادی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، لیکن حالات، وسائل یا مناسب رشتے نہ ملنے کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو پاتے۔ ایسے والدین یقیناً ہمدردی اور دعا کے مستحق ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ بعض اوقات تاخیر کا سبب حالات نہیں، بلکہ ہمارے اپنے فیصلے ہوتے ہیں۔ دعوتی و اصلاحی اسفار کے دوران ایک جملہ بارہا سننے کو ملا۔ ایک بزرگ نے نہایت حسرت کے ساتھ کہا: "حضرت! میری بیٹی کا نصیب خراب نہیں تھا، ہماری سوچ خراب تھی۔ ہم ہر آنے والے رشتے میں کوئی نہ کوئی کمی تلاش کرتے رہے، یہاں تک کہ وقت ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔" یہ صرف ایک شخص کی داستان نہیں، بلکہ ہمارے معاشرے کے ایک بڑے طبقے کی خاموش حقیقت ہے۔

بعض اوقات خود لڑکی بھی غیر شعوری طور پر اس تاخیر کا سبب بن جاتی ہے۔ مناسب اور دیندار رشتہ موجود ہوتا ہے، لیکن اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ابھی مزید تعلیم حاصل کرنی ہے، ابھی عمر ہی کیا ہوئی ہے، ابھی زندگی کے کچھ اور خواب پورے کرنے ہیں۔ تعلیم یقیناً باعثِ عزت ہے، اور اسلام نے علم کی ترغیب دی ہے، لیکن اگر یہی تعلیم بروقت نکاح کی راہ میں مستقل رکاوٹ بن جائے تو انسان کو اپنے فیصلے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ زندگی کا ہر مرحلہ اپنے وقت پر حسین معلوم ہوتا ہے، اور ہر نعمت اپنی جگہ پر خوبصورت لگتی ہے۔

کبھی یہ تاخیر والد کی خوش فہمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ یہ سوچ کر ایک کے بعد ایک رشتہ واپس کرتا رہتا ہے کہ بیٹی مزید پڑھ لے گی تو اس سے بہتر رشتہ مل جائے گا، زیادہ مالدار خاندان مل جائے گا، یا معاشرے میں زیادہ نمایاں مقام رکھنے والا گھرانہ مل جائے گا۔ انتظار بڑھتا رہتا ہے، لیکن وقت کسی کے لیے نہیں رکتا۔ پھر ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب وہی باپ حسرت سے کہتا ہے کہ کاش! اس وقت دینداری اور اخلاق کو ترجیح دی ہوتی۔ بعض گھروں میں ماں کی بے پناہ محبت بھی غیر شعوری طور پر آزمائش بن جاتی ہے۔ ہر آنے والے رشتے میں کوئی نہ

کوئی کمی دکھائی دیتی ہے۔کبھی گھر چھوٹا ہے،کبھی آمدنی کم ہے،کبھی ذاتی مکان نہیں،کبھی گاڑی پسند نہیں آتی،کبھی خاندان سماجی حیثیت کے مطابق نہیں لگتا۔یوں معیار بلند سے بلند تر ہوتے جاتے ہیں،مگر عمر کسی معیار کی پابند نہیں ہوتی؛وہ خاموشی سے آگے بڑھتی رہتی ہے۔افسوس اس بات کا ہے کہ ہم نے رشتوں کا معیار وہاں سے لینا شروع کر دیا ہے جہاں اسلام نے کبھی لینے کی تعلیم نہیں دی۔حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے واضح ہدایت دی:

إِذَا أَتَاكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِينَهُ وَ خُلُقَهُ فَزَوِّ جُوهُ" جب تمہارے پاس ایسا شخص رشتہ لے کر آئے جس کے دین اور اخلاق سے تم مطمئن ہو تو اس کا نکاح کر دو۔" یہ وہ معیار ہے جو خاندانوں کو سکون دیتا ہے۔اس کے مقابلے میں مال و دولت، جائیداد اور ظاہری آسائشیں اگرچہ زندگی کو سہولت دے سکتی ہیں،لیکن وہ اچھے کردار اور خوشگوار ازدواجی زندگی کی ضمانت نہیں بن سکتیں۔اسی لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی ترجیحات کا از سرِ نو جائزہ لیں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ بہتر کی تلاش میں ہم اچھے کو بھی کھو بیٹھیں،اور غیر حقیقی توقعات کے تعاقب میں اپنی ہی بیٹی کی عمر کا قیمتی سرمایہ ضائع کر دیں۔جب بیٹی اپنے ہی گھر کی ضرورت بن کر رہ جاتی ہے نکاح میں تاخیر کی ایک صورت وہ ہے جس کا تعلق خواہشات سے نہیں، بلکہ گھریلو حالات سے ہوتا ہے۔یہ مسئلہ بظاہر ہمدردی کا عنوان معلوم ہوتا ہے،لیکن اگر شریعت کی روشنی میں دیکھا جائے تو بعض اوقات یہی ہمدردی ایک بیٹی کے ساتھ ناانصافی کا سبب بن جاتی ہے۔ایسے متعدد واقعات سامنے آئے جن میں رکاوٹ نہ لڑکی تھی،نہ رشتہ، بلکہ گھر کے حالات تھے۔باپ بیماری یا بڑھاپے کا شکار ہو گیا، ماں کمزور ہو گئی، اور خدمت کے لیے کسی سہارے کی ضرورت پیش آ گئی۔ایسے میں بعض والدین نے یہ سوچ لیا کہ اگر بیٹی بھی رخصت ہو گئی تو ہمارا خیال کون رکھے گا؟ چنانچہ اس کی شادی کو خاموشی کے ساتھ مؤخر کیا جانے لگا۔ابتدا میں یہ تاخیر چند ماہ کی ہوتی ہے،پھر چند سال گزر جاتے ہیں،اور ایک دن اچانک احساس ہوتا ہے کہ بیٹی کی عمر کا بہترین حصہ انتظار میں بیت گیا۔

ایک اور تلخ حقیقت یہ بھی ہے،جس کا بہت سے لوگوں نے خود اعتراف کیا ہے۔بعض گھروں میں بھائی اپنی بہن کے نکاح میں اس لیے سنجیدگی نہیں دکھاتا کہ اسے اندیشہ ہوتا ہے: اگر بہن رخصت ہو گئی تو والدین کی خدمت کی ذمہ داری میری اور میری بیوی پر آ جائے گی۔اس لیے وہ نہ مناسب رشتے کی تلاش میں سرگرمی دکھاتا ہے،نہ آنے والے رشتوں کو اہمیت دیتا ہے،اور نہ ہی بہن کے مستقبل کو اپنی اولین ذمہ داری سمجھتا ہے۔یہ سوچ وقتی سہولت تو دے سکتی ہے،لیکن نہ شرعاً درست ہے اور نہ اخلاقاً۔اسلام نے والدین کی خدمت کو عظیم عبادت قرار دیا ہے،مگر اس کے ساتھ ہر صاحبِ حق کو اس کا حق ادا کرنے کی بھی تعلیم دی ہے۔والدین کی خدمت کے نام پر بیٹی کے حقِ نکاح کو غیر معینہ مدت تک مؤخر کر دینا عدل نہیں، کیونکہ شریعت کسی ایک حق کی حفاظت کے

لیے دوسرے حق کو پامال کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔اسی حقیقت کی طرف رسول اللہ ﷺ نے اس ارشاد میں رہنمائی فرمائی: أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيكَ "تو اور تیرا مال تیرے والد کا ہے۔" اس حدیث میں بیٹوں کو والدین کے حقوق ادا کرنے کی ذمہ داری یاد دلائی گئی ہے۔اس کا مفہوم یہ نہیں کہ بہنوں کی زندگیاں روک کر والدین کی خدمت ان کے سپرد کر دی جائے، بلکہ یہ کہ اولاد، خصوصاً بیٹے، اپنے والدین کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ بیٹی اگر اپنے والدین کی خدمت کرے تو یہ اس کے حسنِ اخلاق، محبت اور ایثار کی روشن دلیل ہے، لیکن اس احسان کو اس کی مستقل ذمہ داری بنا دینا اور اسی بنیاد پر اس کے نکاح میں تاخیر کرنا انصاف کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے بیٹی کو بھی عزت کے ساتھ جینے، اپنا گھر بسانے اور ایک باوقار خاندانی زندگی گزارنے کا حق دیا ہے۔اس لیے کوئی بھی ایسی مصلحت، خواہ وہ کتنی ہی جذباتی کیوں نہ ہو، اس حق کو سلب کرنے کا جواز نہیں بن سکتی۔اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے گھروں میں سکون اور برکت قائم رہے تو ہمیں ذمہ داریوں کو ان کی صحیح جگہ پر رکھنا ہوگا۔ والدین کی خدمت یقیناً سعادت ہے، لیکن اس سعادت کی قیمت کسی بیٹی کی پوری زندگی نہیں ہونی چاہیے۔نکاح کو مشکل نہیں، آسان بنائیے ان تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ایک حقیقت روزِ روشن کی طرح سامنے آتی ہے کہ نکاح میں تاخیر کا مسئلہ کسی ایک فرد، ایک خاندان یا ایک طبقے کا پیدا کیا ہوا نہیں، بلکہ یہ ہماری اجتماعی سوچ کا نتیجہ ہے۔ جہاں لڑکے والوں کو اپنی ناجائز خواہشات اور بے جا مطالبات پر نظرثانی کی ضرورت ہے، وہیں لڑکی والوں کو بھی اپنے فیصلوں کا بے لاگ محاسبہ کرنا چاہیے۔اصلاح اسی وقت ممکن ہے جب ہر شخص اپنا حصہ تسلیم کرے۔

اسلام نے نکاح کو عبادت بھی قرار دیا ہے اور معاشرے کی پاکیزگی کا مضبوط ذریعہ بھی اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے نکاح کے باب میں آسانی کو پسند فرمایا اور امت کو غیر ضروری رکاوٹیں کھڑی کرنے سے روکا۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے: خَيْرُ النِّكَاحِ أَيْسَرُهُ" سب سے بابرکت نکاح وہ ہے جو سب سے زیادہ آسان ہو۔" اسی طرح جب ایک دیندار اور بااخلاق شخص رشتہ لے کر آئے تو محض دنیاوی کمیوں کی وجہ سے اسے رد کرتے رہنا بھی درست طرزِ عمل نہیں۔رسول اللہ ﷺ نے تنبیہ فرمائی: إِلَّا تَفْعَلُوا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ عَرِيضٌ "اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا۔"

آج ہمارے معاشرے کی بہت سی پریشانیاں اسی حقیقت کی عملی تصویر معلوم ہوتی ہیں۔ جب نکاح آسان نہیں رہتا تو بے شمار پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں، جن کا خمیازہ افراد بھی بھگتتے ہیں اور خاندان بھی۔اس لیے

ہر والد سے یہ عرض ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے مستقبل کو غیر حقیقی امیدوں کے سپرد نہ کرے۔

ہر ماں سے گزارش ہے کہ وہ آسائشوں کی فہرست کے بجائے اخلاق اور دینداری کو ترجیح دے۔

ہر نوجوان لڑکی سے درخواست ہے کہ وہ زندگی کے اہم فیصلوں میں وقتی جذبات کے بجائے دور اندیشی سے کام لے۔

اور ہر بھائی کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بہن کی زندگی کو اپنی سہولت کے لیے مؤخر کرنا نہ مروّت ہے، نہ شریعت، نہ غیرت۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ والدین کی خدمت ایک عظیم سعادت ہے، مگر اس سعادت کا پہلا مخاطب بیٹا ہے۔ اگر بیٹیاں خدمت کریں تو یہ ان کا احسان ہے، لیکن اس احسان کو ان کی تقدیر بنا دینا انصاف نہیں۔ جس گھر میں ذمہ داریاں اپنے اصل مقام پر ادا کی جائیں، وہاں نہ والدین محروم ہوتے ہیں اور نہ بیٹیاں۔

آخر میں صرف اتنی گزارش ہے کہ اپنے گھروں کا محاسبہ دوسروں کے گھروں کو دیکھ کر نہیں، بلکہ قرآن و سنت کی روشنی میں کیجیے۔ اگر ہمارے کسی فیصلے کی وجہ سے ایک مناسب رشتہ لوٹ گیا، اگر ہماری کسی ضد نے ایک بیٹی کی جوانی انتظار میں گزار دی، اگر ہماری کسی خودغرضی نے اس کے گھر آباد ہونے میں رکاوٹ ڈال دی، تو یہ محض ایک خاندانی غلطی نہیں، بلکہ ایک ایسی امانت میں کوتاہی ہے جس کے بارے میں ایک دن اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دینا ہوگا۔

آیئے! ہم عہد کریں کہ نکاح کو دوبارہ اسی مقام پر لے جائیں گے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے رکھا تھا؛ سادہ، آسان، باوقار اور بابرکت۔ یہی ہمارے معاشرے کی عفت کی حفاظت کا راستہ ہے، یہی ہماری بیٹیوں کی عزت کا تحفظ ہے، اور یہی ہمارے خاندانوں کے استحکام کی ضمانت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے گھروں کو سنت کی روشنی سے منور فرمائے، ہمارے فیصلوں میں عدل و بصیرت عطا فرمائے، اور ہر بیٹے، ہر بیٹی، ہر باپ اور ہر ماں کو ان کے حقوق و فرائض صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

اصلاحی مضامین

کافر ہمیشہ جہنم میں کیوں؟ شبہ کا علمی و عقلی ازالہ

ازقلم: مفتی محمد سلمان قاسمی*

کسی بھی مملکت وسلطنت یا ادارے ومحکمے کا نظام اس کے منتظم کی صواب دید پر موقوف ہوتا ہے۔ وہ اپنی منشا کے مطابق جس بات کو مناسبِ حال سمجھتا ہے، اسے اپنے نظام اور سسٹم کا حصہ بناتا ہے۔ کسی دوسرے شخص یا بیرونی فرد کو اس نظام پر انگشت نمائی یا اس کے تجویز کردہ قوانین میں مداخلت کا حق حاصل نہیں ہوتا، بلکہ عرفِ عام میں بھی کسی کے قائم کردہ نظام پر بے جا اعتراض اور مداخلت کو ناپسندیدہ عمل سمجھا جاتا ہے۔

ہم مسلمانوں کا ایمان و ایقان ہے کہ روزِ قیامت تمام باطل مذاہب ﴿هَبَاءً مَنْثُورًا﴾ کی مانند بے حقیقت ثابت ہوں گے، اور فیصلۂ الٰہی إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران) کے مطابق صرف دینِ اسلام ہی نجات وفلاح کا ضامن ہوگا۔ اس کے بعد اللہ رب العزت مسلمانوں کو ان کے اعمال کے مطابق یا تو دائمی جنت عطا فرمائیں گے، یا بعض گناہ گار مسلمانوں کو وقتی عذاب کے بعد جنت میں داخل فرمایا جائے گا۔

البتہ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے باغی، اس کے رسولوں کے منکر، اور شریعتِ اسلامیہ سے منحرف ہو کر اسی حالت میں مر جائیں گے، انہیں ابد الآباد تک جہنم میں رکھا جائے گا، جیسا کہ قرآن کریم کی متعدد آیات اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں۔

اسی مسئلے کو بنیاد بنا کر معاندینِ اسلام اور بعض مستشرقین اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدل پر اعتراض کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنی محدود اور مختصر زندگی میں کفر و شرک کا ارتکاب کرتا ہے تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی سزا بھی محدود اور وقتی ہونی چاہیے۔ ان کے بقول چند سال یا چند دہائیوں تک کفر کرنے والے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رکھنا عدل وانصاف کے خلاف اور خالقِ کائنات کی شانِ رحمت کے منافی ہے۔

ائمۂ اسلام اور علماءِ امت نے اس اعتراض کے متعدد علمی اور نقلی جوابات بیان فرمائے ہیں، جن میں سے چند اہم مدلل جوابات درج ذیل ہیں۔

---

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

پہلا جواب:

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو پہلے ہی واضح طور پر خبردار کردیا تھا کہ قیامت کے دن کفر وشرک کی کوئی معافی نہیں ہوگی۔ مزید برآں انبیائے کرام علیہم السلام کتبِ سماویہ اور علماءِ حق کے ذریعے ہر دور میں انسانوں کو ہدایت اور راہِ راست کی دعوت دی جاتی رہی۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص پوری زندگی کفر وشرک پر اصرار کرتا رہے اور اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوجائے تو گویا اس نے انتہائی درجے کی سرکشی، تکبر اور اپنے رب کے مقابل بے باکی کا مظاہرہ کیا۔ اسی بنا پر وہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: وَمَنۡ أَظۡلَمُ مِمَّنۡ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِۦ ثُمَّ أَعۡرَضَ عَنۡهَآۚ إِنَّا مِنَ ٱلۡمُجۡرِمِينَ مُنۡتَقِمُونَ (سورہ سجدہ) ترجمہ: اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیات کے ذریعے نصیحت کی گئی، پھر بھی اس نے ان سے منہ موڑ لیا؟ یقیناً ہم مجرموں سے انتقام لینے والے ہیں۔

درحقیقت اصل چیز اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی توحید کو قبول کرنا ہے۔ اعمال تو اس کے بعد ایک فطری ترتیب کے تحت آتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص کفر سے تائب ہوکر اسلام قبول کرلے اور اسی کے فوراً بعد اس کی وفات ہوجائے تو وہ ہمیشہ کے لیے جنت کا مستحق بن جاتا ہے، حالانکہ اس نے نہ کوئی عبادت انجام دی اور نہ ہی کوئی نیک عمل کرنے کا موقع پایا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے رب کی وحدانیت کو قبول کرلیا۔ اس کے برعکس کافر پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور الوہیت کا انکار کرتا رہتا ہے، اسی لیے وہ دائمی عذاب کا مستحق قرار پاتا ہے۔

دوسرا جواب: نیت، ارادہ اور دوامِ عذاب

ایک حکمت یہ بھی ہے کہ شریعتِ اسلامیہ کی رو سے انسان کی نیت، ارادہ اور پختہ عزم بھی آخرت کے اجر و سزا میں مؤثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جب دو مسلمان تلواریں لے کر ایک دوسرے کے مقابل آجائیں تو قاتل بھی جہنم میں ہوگا اور مقتول بھی۔ عرض کیا گیا: یارسول اللہ! قاتل کا جہنم میں جانا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن مقتول کیوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس لیے کہ وہ بھی اپنے ساتھی کو قتل کرنے کا پورا ارادہ رکھتا تھا۔ (متفق علیہ)

اسی اصول کی بنیاد پر بہت سے اہلِ علم نے اس اشکال کا جواب دیا ہے کہ کفار دنیا میں محدود مدت تک کفر کرتے ہیں، پھر ہمیشہ کے لیے جہنم میں کیوں رہیں گے؟

علامہ ابوبکر الحصنیؒ فرماتے ہیں: عذاب اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک اس کا سبب باقی رہے۔ کفر کے معاملے میں اس کا سبب کفر پر قائم رہنے کا پختہ ارادہ اور عزم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ایسے لوگ ہمیشہ دنیا میں زندہ رہتے تو ہمیشہ کفر ہی پر قائم رہتے۔ اسی طرح مومن بھی اپنے ایمان کی بنا پر ہمیشہ کی نعمتوں کا مستحق بنتا ہے، اور اسی حقیقت کی طرف اس قول میں اشارہ ہے کہ: ''مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہوتی ہے''۔

اس پر قرآنِ کریم کی متعدد آیات سے استدلال کیا جاسکتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْه** (سورۃ الانعام) ترجمہ: اگر انہیں دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تو پھر وہی کام کریں گے جن سے انہیں روکا گیا تھا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فطرت اور باطنی کیفیت ایسی ہو چکی تھی کہ وہ ایمان قبول کرنے کے لیے آمادہ ہی نہ تھی، بلکہ اگر انہیں دوبارہ موقع بھی دیا جاتا تو وہ پھر اسی کفر و سرکشی کی طرف لوٹ جاتے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَمَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا.** (سورۃ بنی اسرائیل) یعنی جو شخص دنیا میں حق سے اندھا رہا، وہ آخرت میں بھی اندھا اور راہِ حق سے زیادہ دور ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی گمراہی اور حق سے اندھا پن وقتی نہیں، بلکہ ان کی مستقل کیفیت ہے، اس لیے اس کے نتائج بھی دائمی ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَأَسْمَعَهُمْ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُعْرِضُونَ.** (سورۃ الانفال) ترجمہ: اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو ضرور انہیں سننے کی توفیق دیتا، اور اگر انہیں سنا بھی دیتا تو بھی وہ منہ پھیر کر اعراض ہی کرتے۔

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے اندر ایسی کوئی خیر موجود نہیں جو رحمتِ الٰہی کی مستحق بن سکے۔ اسی حقیقت کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ: جہنم سے ہر اس شخص کو نکال لیا جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان یا خیر موجود ہوگا۔

لہٰذا اگر ان کفار کے دلوں میں ذرہ برابر بھی خیر ہوتا تو وہ بھی جہنم سے نکال لیے جاتے۔

تیسرا جواب: جرم کی سنگینی اور نیت کا دوام

اسی جواب کو حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے قدرے تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا

ہے۔ چنانچہ آپ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

یہ بات تو مسلم ہے کہ سزا جرم کے مناسب ہونی چاہیے، مگر کیا مناسبت کا مطلب یہ ہے کہ جرم اور سزا دونوں کا زمانہ بھی ایک دوسرے کے برابر ہو؟ اگر یہی معیار ہو تو جس جگہ دو گھنٹے تک ڈکیتی پڑی ہو اور ڈاکو گرفتار ہو کر عدالت میں پیش کیے جائیں، وہاں حاکم کو صرف دو گھنٹے کی سزا دینی چاہیے۔ حالانکہ اگر کوئی ایسا کرے تو ہر شخص اسے انصاف کے خلاف سمجھے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جرم اور سزا میں مناسبت کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں کی مدت برابر ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سزا کی شدت جرم کی سنگینی کے مطابق ہو۔

اب غور کیجیے کہ کفر و شرک جیسا جرم، جو بندے کو اپنے خالق و مالک کے مقابل لا کھڑا کرتا ہے، جو ربِ کائنات کی الوہیت، ربوبیت اور حاکمیت کا انکار ہے، کیا معمولی جرم قرار دیا جا سکتا ہے؟ یقیناً نہیں۔ اس لیے شریعت نے اس کی جو سزا بیان کی ہے، وہ جرم کی سنگینی کے اعتبار سے عین عدل اور حکمت کے مطابق ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ جرم شدید تو ہے، لیکن اتنا شدید نہیں کہ اس کی سزا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم ہو، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اشکال محض جرم کی ظاہری صورت کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے، جبکہ شریعت میں ثواب و عقاب کا مدار صرف ظاہری عمل پر نہیں بلکہ نیت، ارادہ اور باطنی کیفیت پر بھی ہوتا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل مدار نیت ہی پر ہے۔

چنانچہ اگر کوئی شخص دھوکے سے شراب پی لے تو اس پر گناہ نہیں ہوگا، اگرچہ صورتِ فعل موجود ہے، کیونکہ اس نے شراب پینے کی نیت نہیں کی تھی۔ اور اگر کوئی شخص شراب پینے کی نیت سے جائے اور کسی وجہ سے اسے شراب کے بجائے کوئی اور مشروب پلا دیا جائے، تو اگرچہ حقیقتاً شراب نہیں پی، لیکن اس کی نیت چونکہ معصیت کی تھی، اس لیے وہ گناہ کا مستحق ہوگا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ شریعت میں محض ظاہری عمل ہی نہیں بلکہ نیت اور ارادہ بھی جزا و سزا کے تعین میں بنیادی کردار رکھتے ہیں۔

لہٰذا اگرچہ ظاہری اعتبار سے کافر کا کفر محدود اور متناہی مدت پر مشتمل ہے، لیکن اس کے باطن میں یہ عزم موجود ہوتا ہے کہ اگر وہ ہمیشہ زندہ رہے تو ہمیشہ اپنے کفر پر قائم رہے گا۔ اسی دائمی ارادے اور مسلسل سرکشی کی بنا پر اس کا عذاب بھی دائمی قرار دیا گیا۔

اس کے برعکس مومن کا ایمان اگرچہ دنیاوی زندگی کے اعتبار سے محدود ہے، لیکن اس کی نیت یہ ہوتی ہے

کہ اگر اسے ہمیشہ زندگی مل جائے تو وہ ہمیشہ اپنے رب کی اطاعت اور ایمان پر قائم رہے گا۔ اسی لیے وہ ابدی نعمتوں اور دائمی جنت کا مستحق بنتا ہے۔ (ماخوذ از: اشرف الجواب، ص:۱۶، ۱۷)

خلاصۂ بحث

مذکورہ تفصیل سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ کفار کے دائمی عذاب پر کیا جانے والا اعتراض درحقیقت اسلامی تصورِ جزا و سزا کو مکمل طور پر سمجھے بغیر پیدا ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم، احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمۂ امت کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ دائمی عذاب کی بنیاد محض چند سالہ ظاہری کفر نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقابل مسلسل بغاوت، حق کے انکار، اتمامِ حجت کے بعد اعراض، اور اس باطنی ارادے پر ہے جس کے تحت کافر ہمیشہ کفر پر قائم رہنا چاہتا ہے۔

اسی طرح شریعت کا مسلم اصول ہے کہ جزا و سزا کا تعلق صرف ظاہری اعمال سے نہیں بلکہ نیتوں، ارادوں اور قلبی کیفیات سے بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ جس شخص کی نیت ہمیشہ کفر پر باقی رہنے کی ہو، اس کے لیے دائمی عذاب کا فیصلہ عقل، نقل اور عدل؛ تینوں کے اعتبار سے قابلِ فہم اور حکمت کے مطابق ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ مسئلۂ تخلیدِ کفار فی النار محض فلسفیانہ بحث نہیں، بلکہ یہ عقیدۂ آخرت، عدلِ الٰہی، حکمتِ ربانی اور اسلامی اصولوں سے متعلق ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حق کو حق سمجھنے، اس پر ثابت قدم رہنے، اور ہر قسم کے شبہات و فتنوں سے محفوظ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اصلاحی مضامین

دعا، توسل اور ہمارے مسلکی رویّے

(بریلوی مسلک کے تناظر میں)

ازقلم: محمد افتخار الحسن رضوی*

ہم گزشتہ کئی برسوں سے ایک بات مسلسل عرض کرتے آئے ہیں کہ استغاثہ، استعانت اور توسل کے باب میں ہم نے تدریجاً ایسی وسعت پیدا کر دی ہے جو نہ قرآن وسنت کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے، اور نہ ہی سلفِ صالحین کے عملی اسلوب سے۔ آج ذرا اپنے دینی اجتماعات کا غیر جانب دارانہ جائزہ لیں۔ دعا شروع ہوتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے حضور عجز وانکسار کے بجائے طویل سلسلۂ وسائط ووسائل پیش کیے جانے لگتے ہیں۔ سلاسلِ طریقت کے مشائخ، ان کے اسلاف، ان کی اولاد، ان کے خاندان، ایک کے بعد ایک نام، بار بار تکرار کے ساتھ، گویا دعا کی اصل روح ان تذکروں کے ہجوم میں کہیں دب کر رہ جاتی ہے۔ حالانکہ دعا کیا ہے؟ دعا بندے اور اس کے رب کے درمیان محبت، عبودیت اور احتیاج کا وہ پاکیزہ مکالمہ ہے جس میں کوئی تصنع نہیں ہوتا، کوئی تکلف نہیں ہوتا، کوئی دکھاوا نہیں ہوتا۔ بندہ اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتا ہے، دل کو یکسو کرتا ہے، نگاہِ امید صرف اپنے رب پر مرکوز کرتا ہے، اور اپنے خالق سے راز و نیاز کرتا ہے۔ یہی دعا کی روح ہے۔ لیکن جب دعا کے دوران مسلسل واسطوں، نسبتوں اور شخصیات کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ بندے کی توجہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے ہٹنے لگے، تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم نے دعا کی اصل روح کو کہیں پسِ پشت تو نہیں ڈال دیا؟ اس سے بھی زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ بعض مواقع پر الفاظ کا رخ اس انداز میں بدل جاتا ہے کہ اٹھے ہوئے ہاتھ اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے کے بجائے مخلوق سے فریاد اور استعانت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ مقام نہایت حساس ہے۔ یہاں جذبات سے زیادہ احتساب کی ضرورت ہے۔

صاحبو! اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے بہت محبت فرماتا ہے۔ وہ خود فرماتا ہے کہ اُدۡعُوۡنِیۡٓ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ " مجھے پکارو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔" پھر ہم اپنے رب کے ساتھ اس براہِ راست تعلق کو اتنا پیچیدہ

کیوں بنا دیتے ہیں؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اہلِ اللہ سے محبت ایمان کا حصہ ہے، نیک لوگوں کی صحبت باعثِ خیر ہے، ان کی دعائیں باعثِ برکت ہیں، اور ان کے صالح اعمال ہمارے لیے نمونہ ہیں۔ لیکن ان تمام برکتوں کے باوجود یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ استعانتِ حقیقی، فریادرسی اور حاجت روائی حقیقت میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے۔

میں ہرگز یہ الزام نہیں لگاتا کہ لوگ شعوری طور پر اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک ٹھہراتے ہیں۔ لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ بعض اوقات انسان کی عادتیں، اس کے الفاظ اور اس کے معمولات لاشعوری طور پر اسے ایسے راستے پر لے جاتے ہیں جہاں خالق کے ساتھ تعلق کمزور اور واسطوں پر اعتماد مضبوط ہونے لگتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہر صاحبِ ایمان کو رُک کر اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔ اپنے رب سے تعلق مضبوط کرو۔ اپنی دعاؤں کو براہِ راست اسی کے حضور پیش کرو جو چاہتا ہے کہ اس سے طلب کیا جائے اور وہ اپنی کامل طاقت وقدرت کے ساتھ عطا کرسکتا ہے، اسے کسی مدد و شراکت، وسائل و وسائط کی حاجت نہیں ہے۔ اپنی امیدوں کا مرکز بھی وہی ہو، اپنے خوف کا محور بھی وہی ہو، اور اپنی حاجتوں کا دروازہ بھی صرف اسی کو سمجھیے۔

مشائخِ طریقت قابلِ احترام ہیں، اولیائے کرام قابلِ محبت ہیں، اہلِ علم قابلِ توقیر ہیں؛ لیکن وہ سب اللہ تعالیٰ کے محتاج بندے ہیں، اور ہم بھی۔ اصل سہارا صرف وہی ہے... اصل فریادرس صرف وہی ہے... اصل کارساز صرف وہی ہے... وہ ایک ہے۔ وہی واحد ہے۔ وہی حق ہے۔ اور اس کی قدرت، رحمت اور عطا کا کوئی بدل، کوئی شریک اور کوئی متبادل نہیں۔ اپنے عقیدے، اپنی دعاؤں اور اپنے رب کے ساتھ تعلق کا ازسرِنو جائزہ لیں؛ کہیں ایسا تو نہیں کہ محبت کے اظہار میں ہم نے توحید کی لطافت اور دعا کی اصل روح کو خود اپنے ہاتھوں دھندلا دیا ہو؟۔

شعور وآگہی

قومی مردم شماری 2027

قلمی کاوش: محمد اعجاز الدین احمد عاجز۔ رابطہ: 9700389755

طویل وقفے، بدلتے ہوئے معاشی وسماجی حالات اور ایک نئی قومی ضرورت کے بعد وہ وقت قریب ہے جب ملک ایک بار پھر اپنی اجتماعی ہیئت اور آبادی کے پھیلاؤ کو سمجھنے کے لیے مردم شماری ۲۰۲۷ کے وسیع تر عمل کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ یہ مردم شماری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ملک نہ صرف اپنے موجودہ خدوخال کو دیکھے گا بلکہ آنے والے برسوں کے راستے بھی اس کے عکس سے تراشے جائے گا۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں مردم شماری ہمیشہ محض اعداد وجمع کرنے کا کام نہیں رہی یہ دوالحہ ہے جب قومیں اپنے وجود کا جائزہ لیتی ہیں، اپنی معاشرت، اپنی حرکیات اور اپنی خوابیدہ سمتوں کو پہچانتی ہیں۔

ہندوستان میں مردم شماری کا باقاعدہ آغاز ۱۸۷۲ میں ہوا تھا، جب برطانوی دور میں پہلی بار ملک کی آبادی کو منظم طریقے سے جانچنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۸۸۱ میں پہلی باقاعدہ مردم شماری کی بنیاد رکھی گئی جو اس کے بعد ہر دس برس بعد دہرائی جاتی رہی۔ تب سے اب تک ہر مردم شماری محض ایک سرکاری تقاضا نہیں، بلکہ ایک زندہ تہذیب کی نبض معلوم کرنے کا ذریعہ رہی ہے۔ ہر دہائی کے ساتھ ملک کی آبادی میں اضافہ، شہروں کا پھیلاؤ، معاشرتی تبدیلیاں تعلیم وروزگار کے رجحانات اور سماجی ہیئت میں آنے والی نئی پرتیں اس مردم شماری کے ذریعے قومی شعور کا حصہ بنتی رہی ہیں۔

آئینی اور قانونی بنیاد:

مردم شماری کا آئینی جواز ملک کے آئین میں مضمر ہے۔ آئین ہند کی ساتویں شیڈول کی فہرست اول (مرکزی فہرست) کے آئٹم نمبر 69 کے تحت مردم شماری کا اختیار مکمل طور پر مرکزی حکومت کے پاس ہے۔ یہ شق واضح کرتی ہے کہ پورے ملک میں مردم شماری کرانا، اس کا نظام وضع کرنا، اس کے قواعد مرتب کرنا اور اس کے نتائج کا انتظام کرنا مکمل طور پر وفاقی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مردم شماری ہمیشہ ایک قومی عمل سمجھا

جاتا ہے، جس میں تمام ریاستیں مرکز کے ساتھ باہمی تعاون کے ذریعے حصہ لیتی ہیں۔آئینی اختیار کی بنیاد پر ہی حکومت نے مردم شماری ایکٹ ۱۹۴۸ نافذ کیا، جو اس عمل کو قانونی تحفظ فراہم کرتا ہے۔ یہ قانون نہ صرف مردم شماری کے طریق کار، سوالنامے اور انتظامات کو باقاعدہ بناتا ہے بلکہ جواب دہندگان اور شمار کنندگان دونوں کی ذمہ داریوں کا تعین بھی کرتا ہے۔اس قانون کے مختلف سکشن اور اس کے تحت قواعد ذیل میں ہیں۔

سکشن ۳مرکزی حکومت کو مردم شماری کرانے کا اختیار

سکشن ۴: کمشنر مردم شماری اور ریاستی ڈائریکٹرز کی تقرری

سکشن ۸ (۱): سوالنامہ یا شیڈول کا سرکاری گزٹ میں شائع ہونا

سکشن ۸ (۲): ہر شہری پر درست جواب دینے کی قانونی ذمہ داری

سکشن 1: تعاون نہ کرنا یا غلط معلومات دینا قابل سزا جرم

سکشن ۱۵ (ب): فراہم کردہ معلومات مکمل طور پر خفیہ اسے کسی عدالتی یا انتظامی کاروائی میں ثبوت کے طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔یہی وہ قانونی ستون ہیں جن کی مردم شماری ۲۰۲۷ اپنے آخری مرحلوں کی تیاری میں ہے۔

جیسا کہ کہا گیا سیکشن ۸ (۱) کے تحت مرکزی حکومت کو اختیار حاصل ہے کہ وہ مردم شماری کے سوالنامے یا شیڈول کو سرکاری گزٹ میں نوٹیفائی کرے، اور اس شق کے مطابق مردم شماری ۲۰۲۷ کا سوالنامہ اپنی آخری شکل اختیار کر رہا ہے۔جبکہ سیکشن ۸ (۲) عام شہریوں پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے علم اور یقین کے مطابق تمام سوالات کے درست جوابات فراہم کریں، کیونکہ مردم شماری نہ صرف ایک قانونی تقاضا ہے بلکہ ایک اجتماعی امانت بھی ہے۔اسی قانون کے تحت فراہم کردہ معلومات کو انتہائی خفیہ تصور کیا جاتا ہے اور اسے کسی عدالتی یا انتظامی کارروائی میں بطور ثبوت استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

بھارتی آئین کی دفعہ ۸۱ لوک سبھا (ہاؤس آف دی پیپلز) کی ساخت اور اس میں نشستوں کی تقسیم سے متعلق ہے، جو آبادی کی بنیاد پر حلقوں کی حد بندی کرتی ہے اور اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ ہر ریاست کو نمائندگی ملے جس کا مقصد جمہوری عمل میں عوام کی بھرپور شمولیت اور درست نمائندگی کا نظام قائم کرنا ہے۔

ہندوستانی آئین کی دفعہ ۸۴ دراصل جمہوری ڈھانچے کی وہ بنیاد ہے جو آبادی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ نمائندگی کے توازن کو برقرار رکھنے کی ذمہ دار ہے۔اس دفعہ کے تحت ہر نئی مردم شماری کے بعد لوک سبھا کے انتخابی حلقوں کی حد بندی اور نشستوں کی از سر نو تقسیم لازمی قرار دی گئی ہے تاکہ ہر خطہ اپنی آبادی کے تناسب سے آواز

پا سکے لیکن ایک طویل آئینی توقف نے اس قدرتی عمل کو برسوں سے جامد کر رکھا ہے۔

مردم شماری کے بعد حلقہ بندی کا اصول:

دفعہ ۸۲ کے مطابق جب بھی نئی مردم شماری مثال ۲۰۲۱ کی منعقد ہوتی ہے، تو ایک حلقہ بندی کمیشن تشکیل دیا جانا چاہیے جو ملک کے ہر حصے میں آبادی کا توازن دیکھتے ہوئے حلقوں کی نئی تقسیم کرے، تاکہ نمائندگی کا بوجھ اور حق دونوں منصفانہ طور پر تقسیم رہیں۔

حد بندی کا منجمد ہونا:

سنہ ۱۹۷۶ کی بیالیسویں آئینی ترمیم نے اس پورے عمل کو پہلی بار ۲۰۰۱ تک کے لیے روک دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ریاستیں جنہوں نے آبادی پر قابو پانے کی پالیسیاں کامیابی سے نافذ کی تھیں نشستوں کی ممکنہ کمی سے متاثر نہ ہوں۔

بعد ازاں چوراسی آئینی ترمیم (۲۰۰۱) کے ذریعے یہ توقف مزید بڑھا کر ۲۰۲۶ تک کر دیا گیا۔ یوں نئی حد بندی اب اس وقت ممکن ہوگی جب ۲۰۲۶ کے بعد کی صورت حال سامنے آئے گی اور ۲۰۲۱ کی مردم شماری کی بنیاد پر حلقوں کی از سرِ نو تقسیم عمل میں لائی جائے گی۔ دفعہ ۸۲ دراصل منصفانہ نمائندگی کی ضمانت ہے مگر آئینی التوا کے باعث اس کا عملی نفاذ ۲۰۲۶ کے بعد ہی نئی رُوپ ریکھا کے ساتھ سامنے آئے گا وہ وقت جب ہندوستان کی انتخابی سیاست ایک نئے جغرافیائی توازن میں ڈھل سکتی ہے۔

مردم شماری ۲۰۲۷ء اسی تاریخی سلسلے کا تازہ باب ہے، مگر اس کی اہمیت اس لیے بڑھ گئی ہے کہ ۲۰۱۱ کے بعد ملک نے معاشی نمو، شہروں کے بے ہنگم پھیلاؤ، دیہی سے شہری ہجرت صنعتی مراکز کے اُبھرنے اور طبقات کی نئی تشکیل کے ایسے مراحل دیکھے جن کا کوئی جامع، تازہ اور سائنسی ریکارڈ موجود نہیں۔ پچھلے برسوں میں آنے والے بے شمار تغیرات نے سماج کو جس طرح نئے قالب دیے ہیں، انہیں صحیح معنوں میں سمجھنے کے لیے یہ مردم شماری ایک ناگزیر قومی ذمہ داری بن چکی ہے۔

مرکزی حکومت نے پارلیمنٹ میں جو منصوبہ پیش کیا ہے، اس کے مطابق مردم شماری دو بنیادی مراحل میں انجام پائے گی۔ پہلے مرحلے میں مکانات کی فہرست سازی اپریل سے ستمبر ۲۰۲۶ تک جاری رہے گی، جس میں ملک کے ہر گھر، ہر بستی اور ہر آبادی کی بناوٹ، رہائشی حالات اور مکانی ڈھانچے کی تصویر مرتب کی جائے گی۔

دوسرے مرحلے میں فروری ۲۰۲۷ میں افراد کی گنتی ہوگی، اور یکم مارچ ۲۰۲۷ کا کی تاریخ کو پورے

عمل کا حوالہ قرار دیا جائے گا۔ برف پوش علاقوں میں موسم کی شدت کے باعث شمار ستمبر اور اکتوبر ۲۰۲۶ میں ہی مکمل کیا جائے گا۔اس منظم ترتیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت چاہتی ہے کہ کوئی ریاست جغرافیے یا موسم کے فرق کی وجہ سے پیچھے نہ رہ جائے۔

اس مردم شماری کا سب سے اہم اور تاریخی پہلو ذات کی گنتی ہے، جو ۱۹۳۱ کے بعد پہلی بار پوری آبادی کے لیے کی جائے گی۔۱۹۳۱ میں کی گئی اس مردم شماری نے تحفظات کا طریقہ کار وضع کرنے میں بالخصوص منڈل کمیشن رپورٹ ۱۹۸۰ میں اہم کردار ادا کیا۔ذات کا انصاف پسند اور سائنسی تجزیہ کسی بھی سماج کے لیے اس کی تاریخی ساخت کو سمجھنے کا بنیادی ذریعہ ہوتا ہے، کیوں کہ ذات صدیوں سے بھارت کے معاشرتی تانے بانے میں ایک لطیف مگر مضبوط دھاگے کی طرح پیوست ہے۔۔ درج فہرست ذاتوں (ایس سی) اور درج فہرست قبائل (ایس ٹی) کا شمار آئین کے تحت مطلع شدہ فہرستوں کے مطابق ہوگا، جیسا کہ آئین (درج فہرست ذات) احکام ۱۹۵۰ اور آئین (درج فہرست قبائل) احکام ۱۹۵۰ میں درج ہے۔اگرچہ آزادی کے بعد ۱۹۵۱ میں اس گنتی کو محدود کر دیا گیا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کمی نے پالیسی سازی کے کئی اہم گوشوں میں خلا پیدا کر دیا۔کابینہ کی سیاسی امور کمیٹی نے ۳۰/اپریل ۲۰۲۵ کو اس کی منظوری دی، جس کے بعد ملک کی سماجی ساخت کا وہ پہلو سامنے آئے گا جو ایک عرصے سے تشنہ تھا کر دیا۔

مردم شماری ۲۰۱۱ میں ایک منفرد طریقہ کار اپنایا گیا، جس کے تحت قومی آبادی رجسٹر (این پی آر) کی تیاری کے سوالنامے کو مکانات کی فہرست سازی کے سوالنامے کے ساتھ یکجا کر کے سروے کیا گیا۔اس امتزاج نے مردم شماری کو محض ایک شماریاتی عمل کے بجائے ایک جامع آبادیاتی مشق میں تبدیل کر دیا۔لاجسٹک کامیابی۔ ہندوستان کے متنوع جغرافیائی،لسانی اور سماجی پس منظر میں اس قدر بڑے پیمانے پر مردم شماری کا انعقاد ایک غیر معمولی تنظیمی کامیابی تھی۔اس مشق نے مردم شماری کی مشینری کی بڑی سطح پر ہم آہنگی، منصوبہ بندی اور نفاذ کی صلاحیت کو بخوبی اجاگر کیا۔

سماجی واقتصادی اور ذات کی مردم شماری (ایس ای سی سی) ۲۰۱۱:

دیہی ترقی کی وزارت کی جانب سے منعقدہ ایس ای سی سی۔۲۰۱۱ ایک اہم مطالعہ تھا، جس میں دیہی اور شہری گھرانوں کی سماجی و اقتصادی حیثیت کا جائزہ لیا گیا۔اس مطالعے کی بنیاد کچھ مخصوص اور طے شدہ معیارات (پیرامیٹرز) پر رکھی گئی، جن کی مدد سے گھرانوں کی درجہ بندی کی گئی۔دیہی علاقوں میں یہ مردم شماری محکمہ دیہی ترقی کی نگرانی میں مکمل کی گئی، جبکہ شہری علاقوں میں اس عمل کو وزارت ہاؤسنگ وشہری امور نے انجام دیا۔اس

پورے عمل میں وزارت داخلہ کے تحت رجسٹرار جنرل اور مردم شماری کمشنر آف انڈیا کے دفتر نے تکنیکی معاونت فراہم کی۔ ایس ای سی سی۔۲۰۱۱ کا بنیادی مقصد شواہد پر مبنی پالیسی سازی کو فروغ دینا، فلاحی اسکیموں کی مؤثر اور درست ہدف بندی کو ممکن بنانا اور مختلف سرکاری پروگراموں کے لیے حقیقی مستحقین کی شناخت کو یقینی بنانا تھا۔ اس مردم شماری میں ذات کی گنتی بھی شامل کی گئی تھی، تاہم ذات، قبیلہ یا مذہب کے انفرادی نام عوامی طور پر جاری نہیں کیے گئے تھے، تاکہ حساس معلومات کے غلط استعمال سے بچا جا سکے۔ ایس ای سی سی ۲۰۱۱ ایک منفرد کاغذی مردم شماری تھی جس میں گنتی کے لیے ۶.۴ لاکھ سے زیادہ الیکٹرانک ہینڈ ہیلڈ آلات استعمال کے گئے تھے۔ اس اہم مشق نے شکایات کے ازالے کے مضبوط طریقہ کار کا مظاہرہ کیا، اس بار کی مردم شماری میں سب سے بڑی تبدیلی اس کا عمل ڈیجیٹل ہونا ہے۔ کاغذی رجسٹروں کی جگہ موبائل ایپس نے لے لی ہے، اور شہریوں کو خود اندراج کی سہولت بھی دی جا رہی ہے، جو دنیا کی جدید ترین مردم شماریوں کے طریقہ کار سے ہم آہنگ ہے۔ حکومت نے کئی تکنیکی ایجادات کا اعلان کیا ہے۔ ڈیٹا اکٹھا کرنے کے لیے موبائل ایپس کا پہلی بار استعمال کثیر لسانی تعاون کے ساتھ مردم شماری کی نگرانی اور انتظامی پورٹل۔ مردم شماری کے دونوں مراحل کے لیے عوام کے لیے آن لائن خود کار گنتی ڈیٹا پروسیسنگ کو ہموار کرنے کے لیے کوڈ ڈائرکٹری۔ ۳۵/لاکھ سے زیادہ فیلڈ فنکشنز کی تربیت۔ خود کار توثیق اور جانچ کا مربوط طریقہ کار

اس قومی مشن میں پینتیس لاکھ شمار کنندگان اور نگران افسران کی شرکت اس بات کی علامت ہے کہ یہ عمل ملک کی مجموعی توانائی کا مظہر ہے۔ بیشتر شمار کنندگان پرائمری اسکولوں کے اساتذہ ہوں گے گویا تعلیم کا چراغ تھامے ہوئے افراد ہی ملک کی اجتماعی شناخت کا ریکارڈ مرتب کریں گے۔ یہ انتظامی حکمت عملی اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ شمار کا عمل تربیت یافتہ اور ذمہ دار ہاتھوں میں ہوگا۔ ہندوستان کی آبادی جامد نہیں یہ مسلسل سفر کرتی زندگیوں کی کہانی ہے۔ صنعتی شہروں میں کام کرنے والے مزدور، زرعی علاقوں سے روزگار کی تلاش میں نکلنے والے نوجوان، یا میٹروپولیٹن شہروں کی بستیوں میں بسنے والے خاندان، یہ سب اپنے اصل گھروں سے دور ایک نئی دنیا بناتے ہیں۔ مردم شماری ۲۰۲۷ کا ان سب لوگوں کو ان کے موجودہ مقام سکونت پر شمار کرے گی تاکہ شہروں اور ریاستوں کی حقیقی آبادی کا نقشہ سامنے آسکے۔ یہ معلومات آئندہ دہائی کی شہری منصوبہ بندی، ٹرانسپورٹ صحت، روزگار اور بنیادی ڈھانچے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرے گی۔ شفافیت اس مردم شماری کا بنیادی ستون ہے۔ ریاستوں کو حقیقی وقت میں اعداد وشمار تک رسائی دی جائے گی تاکہ اعتماد اور کھلے پن کی فضا قائم رہے۔ مردم شماری ایکٹ ۱۹۴۸ اور اس کے تحت جاری کردہ قواعد ریاستی اداروں شہریوں اور شمار کنندگان کو

ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ ہر شہری پر لازم ہے کہ وہ اپنے علم کے مطابق درست معلومات فراہم کرے، تاکہ قومی ریکارڈ ایک مستند اور قابل اعتماد دستاویز بن سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر مردم شماری قوم کے ساتھ ایک وعدہ ہوتی ہے سچائی کا شفافیت کا اور اس اعتماد کا کہ ریاست اپنے لوگوں کو پوری عزت اور دیانت کے ساتھ شمار کرے گی۔ ۲۰۲۷ کی مردم شماری اس وعدے کی ایک نئی شکل ہے۔ یہ گنتی محض خانوں میں درج ہونے والے اعداد نہیں، بلکہ ان لاکھوں زندگیوں کی کہانی ہے جو ملک کی معاشرتی اور تہذیبی جڑوں کو معنیٰ بخشتی ہیں۔ یہ عمل ہمیں بتائے گا کہ ہم کہاں پہنچ چکے ہیں اور آگے کس سمت بڑھنا ہے۔ ایک ایسی قوم جو اپنے آپ کو گننے کی ہمت رکھتی ہے، وہ اپنے مستقبل کو بھی بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مردم شماری ۲۰۲۷ء کا اسی یقین، اسی روشنی اور اسی اجتماعی خود شناسی کا سفر ہے ایک ایسا سفر جس کے ذریعے ملک آئندہ دہائیوں کی بنیاد منظم اور مضبوط خطوط پر استوار کرے گا۔

(مطبوعہ 8/دسمبر 2025،نقوش سپلیمنٹ روزنامہ منصف حیدرآباد)

علماء کو دو چیزوں سے گریز کی ضرورت

حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا:

جی چاہتا ہے کہ علماء میں دو چیزیں بالکل نہ ہوں، ایک کبر اور ایک طمع۔ اس کی وجہ سے یہ بڑی دولت سے محروم رہتے ہیں، علماء کو امراء سے استغناء چاہیئے۔ یہ لوگ ملاؤں کی حقیر سمجھتے ہیں اور اس حقیر سمجھنے کا زیادہ سبب یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ طامع ہوتے ہیں، اس سے علم میں اور اہلِ علم کی تحقیر اور حقارت ان کے دلوں میں مرکوز ہو جاتی ہے۔

علماء کو ہر وقت اس آیت کا مراقبہ رکھنا چاہیئے (وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)۔ دین میں ضرور محبوبیت کی شان ہے، ضرور مطلوبیت کی شان ہے۔ اگر علماء اپنے وضع پر رہیں، ضرور محبوب رہیں، میں استغناء تو کیا، ذرا استغناء کی نقل کرتا ہوں۔ مگر کم فہم لوگ اس پر مجھ کو ملامت کرتے ہیں کہ سخت ہے۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ میں سخت نہیں ہوں۔ ہاں قلب میں غیرت ضرور ہے۔ اس کو کوئی سختی سمجھے، اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ جب یہ لوگ ملاؤں کو حقیر سمجھتے ہیں، تو ان متکبروں کے ساتھ یہی برتاؤ کرنا مناسب ہے۔ آخر غیرت اور حیا بھی کوئی چیز ہے؟ لیکن اگر کسی کو حس ہی نہ ہو تو اس کا علاج کیا؟ (ماخوذ از: منتخب ملفوظات: ۲۸۷، ۲۸۸)

نقوشِ رفتگاں

دارالعلوم سبیل السلام کے شیخ ثانی وصدر المدرسین

حضرت مولانا مفتی عبدالودود مظاہری رحمہ اللہ

از: مولانا مفتی رفیع حنیف قاسمی*

یہ دنیا عارضی ہے، یہ دار العمل ہے، دار البقاء نہیں، یہاں آنے والے کسی بھی انسان کو دوام حاصل نہیں ہوا، حتی کہ اللہ کے برگزیدہ اور محبوب ومقبول بندے انبیاء اللہ علیہ السلام بھی موت سے دوچار ہوئے، موت سے کسی کو مفر نہیں، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کبھی کسی نے انکار نہیں کیا۔

کچھ جانے والے اپنی حیات مستعار کو قیمتی بنا جاتے ہیں، وہ زندگی کے ایسے انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں، کہ وہ دنیا کے لئے مثالی اور مقتدیٰ بن جاتے ہیں، ان کی زندگی قابلِ اتباع اور قابل تقلید ہوتی ہے، شہر حیدرآباد کی انہیں عظیم علمی اور مثالی شخصیات میں سے ایک شخصیت حضرت مولانا مفتی عبدالودود صاحب مظاہری رحمہ اللہ کی بھی رہی ہے، شہر حیدرآباد کے جید عالم دین، مفتی عظیم، مدرس باکمال تھے، جنہوں نے اپنی حیات مستعار کے تقریبا اکیاون (۵۱) سال درس وتدریس میں گذارے، بحیثیت نائب شیخ الحدیث صدر مفتی وصدر المدرسین سبیل السلام کے وہاں اپنی خدمات انجام دیں، فقہی مسائل پر عبور، فقہی مسائل اور جزئیات زبان زد، علوم کا استحضار، حیدرآباد کے مشہور وباکمال مفتیان میں شمار ہوتا تھا، مجلس علمیہ حیدرآباد کے رکن تاسیسی اور مجلس فقہی حیدرآباد کے رکن رکین بھی تھے۔

پیدائش اور تعلیم وتعلم

مفتی صاحب کی پیدائش ۱۹۵۲ عیسوی میں ہے، مغل گدہ اور کوڑنگل وغیرہ کے علاقائی مدارس میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، گیارہ سال کی عمر میں حفظ قرآن کی تکمیل فرمائی، پھر مظاہر العلوم کا رخ کیا وہاں ابتداء سے لے کر فراغت افتاء تک تقریباً گیارہ سال کے دورانیہ میں تعلیم حاصل کی، مظاہر العلوم سے ۱۹۷٤ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی، پھر دوسال شعبہ افتاء میں گذارے، پھر حیدرآباد واپس تشریف لائے۔ شیخ یونس صاحب جونپوری رحمت اللہ علیہ سے بخاری شریف پڑھی اور شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے مسلسلات کی سند حاصل کی، اس کے علاوہ اس وقت کے بڑے بڑے اکابر اساتذہ سے استفادہ کیا۔

---

* استاذ فقہ وادب: ادارہ کہف الایمان ٹرسٹ، بورہ بنڈہ، حیدرآباد

درس وتدریس

فراغت کے بعد فوراً بعد ہی سے ہی تدریس سے وابستہ ہو گئے، دار العلوم سبیل السلام کو اپنی علمی صلاحیتوں کے لئے جولانگاہ بنایا، تادم حیات مدرسہ کی خدمات سے منسلک رہے، بحیثیت نائب شیخ الحدیث ۲۰۱۸ تا دمِ اخیر وابستہ رہے، صدر المدرسین بھی آپ ہی تھے، اس دورانیہ میں نا جانے کتنے طلباء نے آپ سے علمی استفادہ کیا، چند ایک مشہور شاگردوں میں احمد عبد المجیب صاحب مقیم حال امریکہ، مولانا ظلال صاحب ناظم مدرسہ احیاء العلوم ٹپہ چبوترہ اور مولانا احمد علی صاحب ناظم مدرسہ خیر المدارس شامل ہیں۔

کتابوں میں ابتدائی کتب فنون سے متعلق نحو وصرف کی کتابیں خصوصا کافیہ وغیرہ زیر تدریس رہیں، نحو وصرف پر بڑا درک حاصل تھا، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم نے ان کی نحوی وصرفی لیاقتوں اور اس فن پر ان کے عبور کی وجہ سے ان سے نحو وصرف سے متعلق کتابیں لکھنے کی درخواست کی تھی، اس کے علاوہ مدرسہ سبیل السلام میں جلالین ہدایہ بھی زیر درس رہی، وہاں تقریباً ابتداء سے لے کر بخاری شریف تک تقریبا کتابوں کی تدریس کا موقع ملا، دار العلوم سبیل السلام پر نہ جانے کتنے احوال آئے گئے، لیکن شروع تا دمِ واپسیں وہاں کی تدریسی مشغولیت کو اپنی منزل ومقصود بنایا۔

وقت پر درسگاہ میں حاضری زندگی کا معمول تھا، اس زمانے میں حیدرآباد کے علاقہ ایراہ گڈہ سے پڑھانے کے لئے سبیل السلام جاتے، جس میں اس زمانے میں آدھا گھنٹے کا وقت صرف ہوتا، اس کے علاوہ سبیل السلام کی ایک شاخ ملے پلی میں تھی، جہاں مسائیہ پنج سالہ عالم کورس تھا، وہاں پر بھی تدریس کی خدمات انجام دی، ایراگڈہ میں مسجد کے کمرہ میں اقامت تھی، آخر عمر میں شاہین نگر میں ہی سکونت اختیار کی، ایرہ گڈہ کی جامع مسجد میں امامت وخطابت کی خدمات انجام دی، جس کا دورانیہ ۱۹۸۹ تا ۱۹۹٤ رہا، بدعت پر نکیر کا معمول تھا، جس کی وجہ سے اہل بدعت نے اس مسجد پر اپنا تسلط حاصل کر لیا، پھر اس کے بعد مسجد نور ایراہ گڈہ کی خطابت سے وابستہ رہے، جس کی کمیٹی وہی جامع مسجد ایرہ گڈہ کی کمیٹی تھی، ۲۰۱۹ میں ایکسیڈنٹ کے بعد مسجد نور کی خطابت کو ترک کر دیا، لیکن وہاں کی کمیٹی نے بعد میں وہاں سے ملنے والے مشاہرہ کو تادم حیات باقی وبرقرار رکھا، اس کے علاوہ مسجد زمرم، عنبر پیٹ، جامع مسجد اے سی گارڈ اور مسجد فیصل سالم مانصاحب ٹینک وغیرہ میں بھی مختلف دورانیہ میں امامت کی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

تواضع واخلاق

نہایت متواضع، خوش مزاج، ملنسار، متبع سنت، بدعت کے منکر، کسی بھی مزاج شریعت کے خلاف امور کو

ہرگز نہ پسند فرماتے، منکر پر فورا نکیر آپ کا معمول تھا، ٹخنوں سے اوپر پائجامہ پہنے کا اہتمام، طلباء پر بھی اس معاملہ میں سختی کرتے، بلکہ آپ کو دیکھ کر فورا پائجامہ ٹخنوں سے اوپر کر لیتے؛ بلکہ آپ کی گاڑی یاماہا ایکس 100 کی آواز ایک کلومیٹر دور سے سنائی دیتی، اس سے پہلے طلباء اپنے پائجامہ کو ٹخنوں سے اوپر کرلیا کرتے۔

نمازوں کا بہت زیادہ اہتمام تہا، روزوں اور دیگر اعمال واشغال کی پابندی تو زندگی بھر رہی، لیکن وفات سے قبل والے رمضان میں ایک روزہ ڈیلیسس کی وجہ سے ترک ہوگیا تو اس کی قضاء بھی کی۔ کبھی غنودگی کی کیفیت بھی طاری ہوجاتی، اس دران جونمازیں چھوٹ جاتی، اس کی قضاء بھی فرمالیتے۔ ابتدا میں حضرت مولانا سلمان صاحب اور حضرت مولانا طلحہ صاحب سے بیعت ہوئے اور اخر میں حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی کے خلیفہ حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب پلمنیر سے بھی اصلاحی تعلقات رہے۔

بیماری علالت ووفات

دوفرزندان اور تین دختران پس ماندگان میں چھوڑے، زوجہ محترمہ ۲۰۰۸ میں خالق حقیقی سے جاملیں تھی، اس کے بعد بنفس نفیس تمام اولاد اور بچوں کی نگرانی اور نگہداشت فرماتے رہے، ساری ذمہ داریوں کو بھرپور طور پر انجام دیا، آخر میں پانچ سال تک ۲۰۲۲ سے تادم اخیر طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے مہینہ میں کئی دفعہ ڈیلیسس کرنے پڑتے، کبھی غنودگی کی کیفیت بھی طاری ہوجاتی، اس دران جونمازیں چھوٹ جاتی، اس کی قضاء بھی فرمالیتے۔

احقر نے ابھی قریبی زمانے میں (رمضان کے بعد بقرعید سے پہلے) ہمارے شیخ ومربی حضرت مولانا مفتی طاہر صاحب دامت برکاتہم العالیہ شیخ الحدیث وناظم مظاہر العلوم سہارنپور کی حیدرآباد آمد کے وقت حکیم حافظ جاوید حسین صاحب نے حضرت کو اپنے گھر مدعو کیا تھا، خصوصاً کئی مظاہر علماء اور دیگر شیوخ وکبار اور اصاغرسن علماء کرام اس مجلس کے دعوت طعام مدعو تھے، اس موقع سے حضرت مفتی عبدالودود صاحب کی آمد ہوئی تھی، اس وقت خصوصاً دیدار، شرف ملاقات، گذارش دعا اور علیک وسلیک ہوئی تھی۔ ۱۳-۶-۲۰۲۶ء کو مفتی صاحب اس دارفانی سے رحلت فرما کر راہ عالم بقا ہو گئے، اسی روز بعد نماز عصر نماز جنازہ جامع مسجد کنزالعلوم شاہین نگر میں ادا کی گئی، علماء وطلباء کی کثیر تعداد شریک جنازہ رہی۔

اللہ عزوجل آپ کی مختلف جہات سے انجام دی جانے والی خدمات کو ذخیرہ آخرت بنائے اور مغفرت کا سامان فرمائے، لواحقین واقارب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

افاداتِ اکابر

اشرف المجالس

ترتیب وپیش کش: مفتی محمد احمد علی صاحب قاسمی*

مخدومنا ومحبوبنا حضرت مولانا محمد عبد القوی صاحب مدظلہ العالی ہر جمعہ بعد نمازِ عصر ہفتہ واری اصلاحی مجلس میں حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے ملفوظات کچھ توضیح وتشریح کے ساتھ تعلیم فرماتے ہیں، اُن ملفوظات کو قارئینِ اشرف الجرائد وعامۂ مسلمین کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔ از مرتب

(٦٦) اصل مقصود طبعیت کا پابندِ سنت وشریعت ہوجانا ہے نہ کہ محض بیعت وارادات

ارشاد فرمایا:۔ حضرت تھانویؒ طریقت کے امام تھے، اور آپ کا کام بھی تعلیم وتربیت ہی تھا، بعض پیر چاہتے ہیں کہ جتنے مریدین آجائیں اچھا ہے، اور جتنا حلقہ بڑا ہوجائے اُتنے خوش ہوتے ہیں؛ لیکن فی الحقیقت اصل مقصود نہ بیعت وارادت ہے نہ اوراد واشغال، اصل مقصود اللہ کے دین پر مضبوطی کے ساتھ چلنا ہے، طریق اور معمولاتِ طریق اس کا ایک ذریعہ ہیں، اصل چیز کو چھوڑ کر اگر لوگ صرف رسموں پر اکتفاء کریں تو کیا ملے گا؟ اصل چیز صفاتِ رذیلہ کا زائل ہونا اور صفاتِ حسنہ کا پیدا ہونا ہے، تعلق مع اللہ اور خشیت ومحبت جیسی صفات پیدا ہوجانا ہے، ہماری دین داری حقیقی معنوں میں دین ہوجائے، ہمارا ذوق افکار واعمال کے اعتبار سے سنت کے سانچے میں ڈھل جائے، طریق سے مشائخ کا اصل مقصود یہی تھا، باقی سب چیزیں اس کے وسائل وذرائع ہیں، انہی میں بیعت بھی ایک مفید اور موثر عمل ہے، مگر یہ مقصود نہیں ہے، اگر مقصود اس کے ذریعے سے حاصل ہوجائے تو فَبِہا ونِعمَت، اور اگر اس کے بغیر بھی مقصود حاصل ہوجائے تب بھی کیا کہنے، آدمی کا کام تو بن گیا، تو ضروری کو ضروری اور کم ضروری کو کم ضروری سمجھنا چاہیئے، اب مشکل یہ ہوگئی ہے کہ بہت سے لوگ ارادت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں؛ حالانکہ اصل چیز طبیعت کا شریعت وسنت کا پابند ہوجانا ہے۔

(٦٧) اہلِ باطل کو باطل چھوڑنے کی نصیحت کرنا چاہیے نہ کہ اہلِ حق کو ترکِ حق کی

ارشاد فرمایا:۔ جس بات پر حضرت نے تعجب فرمایا ہے آج کل سب کی عقلیں یہی کام کررہی ہیں، اتحاد

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

اس بات کا نام رکھ لیا گیا ہے کہ غلط کو غلط اور باطل کو باطل مت کہو، خاموشی اختیار کر لو، سب کے ساتھ مل جاؤ، اور اُدھر اہلِ باطل سے کوئی بھی نہیں کہتا کہ آپ غلط ہیں، آپ اس کو چھوڑ دو، سب لوگ اہلِ حق ہی کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ذرا نیچے اتر جائیں، وہ ذرا ہاتھ بڑھا دیں، سب اِدھر ہی مشورے دیتے ہیں، اُدھر بھی تو مشورہ دینا چاہیے، کہ آپ اپنے آپ کو صحیح کر لو، دانشوروں، عقل مندوں، اور علم والوں میں بھی ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ جو لوگ خاص مسلک کے نام پر دوسرے کا مسلک بدلوا رہے ہیں، ہر ایک کی نماز تبدیل کروا رہے ہیں، ہر ایک کو اپنی دعوت دے رہے ہیں، اور دوسرے لوگوں سے نفرت سکھا رہے ہیں، تو ان لوگوں کو کوئی بھی نصیحت نہیں کرتا، نصیحت صرف علمائے حق کو کرتے ہیں، کہ آپ لوگ کیوں بولتے ہیں؟ آپ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ آپ لوگوں کو نرمی سے کام لینا چاہیے، یعنی اتحاد بس یہی ہے کہ اہلِ حق کو خاموش ہو جانا چاہیے، باقی سب کو اپنا کام کر لینے دینا چاہیے، یہ ہے عقل، اسی عقل پر حضرت تھانویؒ تعجب فرما رہے ہیں۔

(۶۸) ذلت کے کھانے کھانے سے تنگی برداشت کر لینا بہتر ہے

ارشاد فرمایا:۔ شیخ سعدیؒ نے نقل فرمایا ہے کہ صوفیا کی ایک جماعت خانقاہ میں رہتی تھی، خانقاہ والوں کو بہت دنوں سے دال روٹی ہی مل رہی تھی، کافی دن اسی طرح گزر گئے، کسی نے کہا: ایک قریشی ہے، وہ گوشت اُدھار دیتا ہے، اتنے دن سے گوشت کھانے کو نہیں ملا، ہم لوگ آج اس سے اُدھار لے آئیں گے، اللہ دے گا تو بعد میں قیمت ادا کر لیں گے، تو مریدوں نے اپنے شیخ سے پوچھا: حضرت! ایسا مشورہ آ رہا ہے، کیا ہم لوگ ادھار لے آئیں؟ شیخ نے فرمایا: کہ دیکھو! اگر میری بات ماننا ہو تو ایسا مت کرو، جیسا چل رہا ہے ویسے ہی چلتے رہنے دو، جب اللہ ہی کی طرف سے اُدھار کے بغیر بندوبست ہو جائے، تب کھا لینا، یہاں نہیں تو انشاء اللہ جنت میں کھائیں گے، پھر وجہ بتائی: کہ تم کو ادھار تو دے دے گا؛ لیکن تم اپنی عزت کھو لو گے۔

بئس المطاعم حين الذل تكسبها

القِدر منتصب والقَدر مخفوض

یعنی بُری خوراک اور کھانے وہ ہیں جو تمہیں ذلت کی ساتھ ملیں، اور اس کہاوت کے مصداق ہیں؛ قِدر یعنی ہانڈی تو چڑھ جائے گی لیکن قَدر یعنی عزت گھٹ جائے گی۔

عربی میں قَدر کہتے ہیں عزت و مرتبہ کو، اور قِدر کہتے ہیں ہانڈی کو، تو فرمایا کہ قِدر تو چڑھ جائے گی، قَدر گر جائے گی، قَدر زیادہ قیمتی ہے، اس کی حفاظت کرو کہ ہماری عزت پہ آنچ نہ آنے پائے، اور ہماری طرف لوگ عیب کے ساتھ انگلی نہ اٹھائیں، اس لئے سالکین کو چاہیئے کہ ایسی حرکتوں سے اپنے آپ کو بچائیں۔

افاداتِ اکابر

ارشاد السالکین

"خانقاہِ سعیدیہ" میں ہر شمسی مہینے کے دوسرے اتوار کو صبح ۹؍ بجے تا شب ۹؍ بجے اصلاحی مجلس منعقد ہوتی ہے، اس میں جنوبی ہند کی تمام ہی ریاستوں سے تقریباً تین سو سالکین شرکت کرتے ہیں، صبح ۱۰ تا ۱۲؍ بجے کی نشست میں شرکاء کے پوچھے گئے سوالات کے جواب مرشدی حضرت اقدس مولانا محمد عبد القوی صاحب مدظلہ العالی خود دیتے ہیں، جو بہت ہی نافع ہوتے ہیں، علماء و عوام سب ہی اس کے قائل ہیں، اس لئے مولانا مفتی محمد احمد علی صاحب قاسمی زید فضلہ استاذ ادارۂ ہذا و مجازِ حضرت والا نے اِن کو جمع کر کے قارئین کے فائدے کے لئے شائع کیا ہے۔ از مرتب

عورتوں کے لئے پردہ کی کتاب

سوال (۱۰۳):۔ عورتوں کے لیے پردہ کی کون سی کتاب مفید ہوگی؟ راہنمائی فرمائیں۔

جواب: پردہ کے سلسلہ میں بہت سی کتابیں ہیں، بعض خود خواتین کی بھی لکھی ہوئی ہیں، بس یہ دیکھ لیں کہ اہل حق کی ہوں، جیسے احکامِ پردہ، مولفہ: مفتی محمد شفیع عثمانیؒ۔ شرعی پردہ، مؤلفہ حکیم الاسلام قاری طیب صاحبؒ۔ اسلامی پردہ، مؤلفہ: حکیم الامت حضرت تھانویؒ۔ عورت اور اسلامی پردہ، مؤلفہ: مولانا محمد یوسف لدھیانوی وغیرہ

حافظہ کے لئے مجرب عمل

سوال (۱۰۴): حافظہ کی تقویت کے لیے کوئی عمل بتادیں۔

جواب:۔ حافظہ میں تقویت کے لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یَا عَلِیْمُ 150 مرتبہ روزانہ پڑھنے کے لیے فرمایا کرتے تھے، اس کا اہتمام کرلیں۔

نوافل پر فرض نمازوں کی قضاء مقدم ہے

سوال (۱۰۵): فرض نمازیں جو قضا ہوگئیں، اس کے لیے نوافل کا ترک کرنا کیسا ہے؟ راہنمائی فرمائیں۔

جواب: جن کی فرض نمازیں زیادہ ترک ہوئی ہوں، اُن کو چاہیے کہ نفل چھوڑ کر قضا نماز پہلے ادا کرلیں؛ کیوں کہ قضا قرض ہے، قرض پہلے ادا کرنا چاہیے، ہدیہ بعد میں دینا چاہیے، اگر متروکہ نمازیں زیادہ نہ ہوں تو نفل

بھی نہ چھوڑے، قضا کا بھی اہتمام کرتا رہے، ہاں اگر زیادہ مقدار میں ہیں تو پہلے فرض سے فارغ ہو جائیں، پھر اسی عادت کو نوافل بنا دیں، فقہاء نے فرمایا ہے کہ جس کے فرائض بہت باقی ہیں وہ سنن مؤکدہ کا بھی ترک کر سکتا ہے۔

فجر کی سنتوں کے اہتمام میں غفلت

سوال (۱۰۶): میری فجر کی سنتیں بہت چھوٹ رہی ہیں، سستی اور استنجے میں تاخیر کی وجہ سے، بہت کوشش کرتا ہوں، لیکن کبھی ہو رہی ہیں، اور کبھی نہیں ہو رہی ہیں، اور جب کہ رات کو بھی جلدی سو جاتا ہوں، کچھ راہنمائی فرمایئے۔

جواب: فجر کی فرض کے واسطے تو آپ اُٹھ ہی جا رہے ہیں، پانچ دس منٹ پہلے اُٹھ جائیں تاکہ آسانی سے تیاری کر سکیں؛ اس طرح سنتیں بھی ہو جائیں گی؛ کیوں کہ یہ آکدالسنن ہے، یعنی سنتوں میں سب سے زیادہ اہم فجر کی سنت ہے، اس لیے اس کو ترک نہیں کرنا چاہیے، دو رکعت پڑھنے کے لیے تین چار منٹ لگیں گے، ماشاءاللہ سے جب فجر پڑھ ہی رہے ہیں تو یہ وقت تھوڑا سا اور اضافہ کر لیں، ایڈجسٹ کر لینا چاہیے، کوئی مشکل نہیں ہے۔

تہجد کی نماز کی توفیق اور اس کی پابندی کی تدابیر

سوال (۱۰۷): ۔تہجد کی نماز کی توفیق کے لیے کیا کریں؟ راہنمائی فرمائیں۔

جواب: ۔توفیق تو سب کو حاصل ہے، اب اس توفیق سے فائدہ اٹھانے کے لیے کیا کریں؟ اس کے بارے میں پوچھیں، اپنے کسی ساتھی (بیوی، والدہ، بھائی، بہن، وغیرہ) سے کہہ دو کہ مجھے فلاں وقت جگا دیجیے، یا سونے سے پہلے الارم رکھ لو۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک وقت تک آدمی سونے کا عادی ہو جاتا ہے، جب وہ وقت ہو جاتا ہے تو کسی کے اُٹھانے کی بھی ضرورت نہیں رہتی، خود ہی اُٹھ جائے گا، اس لئے کہ عادت پوری ہوگئی، اس لئے طئے کرو کہ ”موبائل میں الارم بجے گا تو بند نہیں کروں گا، اُٹھ کے بیٹھ جاؤں گا، جب آنکھ کھلے اُٹھ کے بیٹھ جاؤ، سیدھے سے وضو بنانے کے لیے پہنچ جاؤ، دو چار قدم چلتے ہی نیند کا اثر ختم ہو جاتا ہے، لیکن جب تک وہیں لوٹ پوٹ کرتے رہتے ہیں تو نیند ختم ہوتی نہیں، پھر آتی ہے۔ باقی تھک جانے کی وجہ سے، مصروفیات کی کثرت کی وجہ سے، اور کام ہارڈ اور مشکل ہونے کی وجہ سے اخیر شب میں اُٹھنا بعض کے لئے مشکل ہوتا ہے؛ اس کے لیے یہ سہولت ہے کہ وہ شروع شب ہی میں چار رکعت صلاۃ اللیل پڑھ لے، اب اگر اٹھنے کی ہمت ہوگئی تو تہجد بھی پڑھ لے، نہیں ہوئی تو یہ اس کی جگہ پر آجائے گی، تہجد کا فائدہ آپ کو مل جائے گا۔

مطالعہ کی میز پر

نقد و تبصرہ

نام کتاب: قصاب وقریشی: احکام ومسائل

مصنف: مولانا مفتی احمد اللہ نثار قاسمی صاحب زید مجدہٗ

مبصر: مفتی حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی زید فضلہٗ (استاذ حدیث وفقہ ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد)

ناشر: مکتبہ احسان لکھنؤ

صفحات: 260 قیمت: -/400

ملنے کا پتہ: دارالعلوم رشیدیہ، مہدی پٹنم حیدرآباد

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم امابعد!

فقہِ اسلامی کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے ہر شعبے کے لیے ایسے اصول وضوابط مرتب کیے ہیں جو ہر دور میں انسانیت کی رہنمائی کرتے ہیں۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ بعض شعبے اور پیشے نئے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں، جن کے لیے کتاب وسنت، آثارِ سلف اور اقوالِ فقہاء کی روشنی میں مدلل رہنمائی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ قصاب اور قریشی کا شعبہ بھی انہی تحقیق طلب شعبوں میں سے ایک ہے، جس سے ہزاروں نہیں، لاکھوں افراد وابستہ ہیں؛ لیکن افسوس کہ اس پیشے سے متعلق شرعی احکام سے واقفیت عام نہیں، ذبح کے بہت سے پہلوؤں پر جہالت کا پردہ پڑا ہوا ہے اور گوشت کی خرید وفرخت میں بھی شرعی قوانین کا لحاظ خال خال نظر آتا ہے۔ ایسے حالات میں " قصاب وقریشی: احکام ومسائل" کی اشاعت ایک خوش آئند اقدام اور قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ یہ کتاب نامور عالمِ دین، زود نویس مصنف اور صاحب نسبت شخصیت جناب مولانا مفتی احمد اللہ نثار قاسمی نقشبندی زید مجد ہم کی گراں قیمت کاوش ہے، جو ساٹھ سے زائد علمی ودینی کتابوں کے مرتب ہیں۔

دعوت وتبلیغ، تدریس وافتاء، انتظامی خدمات اور تصنیفی میدان میں ان کی خدمات اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ ان کا قلم ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتا ہے جن کی معاشرے کو واقعی ضرورت ہوتی ہے، اور یہی وصف اس

کتاب میں بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔تقریباً 260 صفحات پر مشتمل یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت وقیع، جامع اور منفرد ہے۔مصنف نے قصاب اور قریشی سے متعلق جزوی اور کلی مسائل کو فقہی تحقیقات، دلائل و براہین اور عملی رہنمائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

کتاب میں قصاب اور قریشی کی تاریخ، ان کا تفصیلی تذکرہ اور ان سے متعلق تاریخی اشارات، نیز مویشی کا تعارف اور ان کو پالنے کے احکام، ذبح اور ذبیحے کے احکام، مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا ذبیحہ، اور مردہ جانور سے متعلق شرعی راہ نمائی پر مشتمل متعدد ابواب کو سلیقہ مندی سے مرتب کیا گیا ہے۔مزید برآں موقع موقع سے تمرینی سوالات بھی دیے گئے ہیں جو مضامین کو مستحضر رکھنے کے لئے بہت مفید ہیں۔اس طرح یہ کتاب صرف مسائل کی فہرست نہیں بلکہ اپنے موضوع پر ایک منظم فقہی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

مصنف نے جہاں ضرورت محسوس کی وہاں قرآن وحدیث، فقہائے امت کی تصریحات اور معتبر فقہی مراجع سے استفادہ کیا ہے۔اختلافی مسائل میں بھی اعتدال، علمی دیانت اور فقہی بصیرت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، جس سے کتاب کی علمی وقعت مزید بڑھ جاتی ہے۔زبان نہایت شستہ، رواں اور عام فہم ہے۔فقہی اصطلاحات کو بھی ایسی سادگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ایک عام قاری بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے، جبکہ اہلِ علم کے لیے حوالہ جات اور تحقیقی نکات اسے مزید قیمتی بنا دیتے ہیں۔یہی امتزاج اس کتاب کو مدارس کے طلبہ، مفتیانِ کرام، ائمہ، قصاب برادری اور عام مسلمان سب کے لیے یکساں مفید بناتا ہے۔کتاب کی علمی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ممتاز عالم دین جناب مولانا مفتی ابوبکر جابر قاسمی مدظلہ نے اپنی تقریظ میں اسے اردو زبان میں اپنے موضوع پر سب سے جامع اور اہم ترین کتاب قرار دیا ہے۔مستند اہلِ علم کی یہ رائے اس کتاب کی افادیت پر ایک معتبر شہادت ہے۔مختصر یہ کہ مصنف نے جس محنت، تتبع اور اخلاص کے ساتھ اس موضوع کو سمیٹا ہے، وہ لائقِ تحسین ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مفتی احمد اللہ نثار قاسمی نقشبندی زید مجدہم (ناظم دار العلوم رشیدیہ وصدر دار الافتاء والارشاد حیدرآباد) کی اس علمی کاوش کو شرفِ قبول عطا فرمائے، اسے امت کے لیے نافع بنائے، اور مصنف کو مزید ایسی علمی و تحقیقی خدمات انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

نوٹ: اس کتاب کے حصول کو ناشرین ومرتبین نے سہل بنایا ہے، طلبہ وعلماء اور اہلِ مدارس کے لیے 50% فیصد خصوصی رعایت رکھی گئی ہے۔تاجر حضرات تاجرانہ معاملت ومنفعت کے لئے مولانا طیب صاحب سے اس نمبر 8341658711 پر رابطہ کریں۔

فقہ وفتاویٰ

آپ کے شرعی مسائل

از: مفتی محمد ندیم الدین قاسمی*

چندہ کا اعلان ” ایاك نستعين “ کے منافی ہے؟

سوال: آج کل مساجد میں چندہ کے لئے باقاعدہ اعلان کیا جاتا ہے، تو اس سے ” ایاك نستعين “ کی مخالفت تو لازم نہیں آتی ہے؟

جواب: چندہ کا اعلان (مدرسہ یا دینی کام یا کسی مصیبت زدہ کی امداد کے لئے) ” ایاك نستعين “ کے منافی نہیں؛ بلکہ احادیث سے ثابت ہے۔ (محمود الفتاویٰ، ۱/ ۳۴۷)

کیا دعا سے موت ٹل جاتی ہے؟

سوال: دعاؤں سے موت ٹل جاتی ہے یا نہیں؟

جواب: اگر تقدیر میں یوں لکھا ہوا ہے کہ فلاں اگر دعا کرے گا تو اس کی موت اتنے وقت لئے ٹل جائے گی، تو دعا سے بھی موت ٹل سکتی ہے ورنہ نہیں۔ (محمود الفتاویٰ، ۱/ ۳۵۹)

کیا جانوروں کی روح حضرت عزرائیل علیہ السلام نکالتے ہیں؟

سوال: کیا جانوروں کی روح بھی حضرت عزرائیل علیہ السلام ہی نکالتے ہیں؟

جواب: یہ چیز نظر سے نہیں گذری، ویسے آپ کا یہ سوال عمل یا عقیدہ سے متعلق نہیں ہے جس کے لئے تلاش کی زحمت اٹھائی جائے۔ (محمود الفتاویٰ، ۱/ ۳۶۶)

جب آپ ﷺ آخری نبی ہیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپؐ کے بعد کس حیثیت سے تشریف لائیں گے؟

سوال: میں نے سنا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں تشریف لائیں گے، تو بہ حیثیتِ نبی آئیں گے، تو میں تذبذب میں ہوں؛ کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر محمد ﷺ آخری نبی اور رسول ہیں، اور

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

آپؐ کے بعد اس دنیا میں کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا۔

جواب: جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے، تو بہ دستور نبی ہوں گے؛ لیکن چوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے ان کی شریعت منسوخ ہوگئی؛ اس لیے جب وہ تشریف لائیں گے تو شریعتِ محمدیہ کی پیروی کریں گے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتی کی حیثیت سے آئیں گے۔

(منتخب فتاویٰ دار العلوم دیوبند، ۱/ ۸۴)

اللہ، رحمٰن ورحیم ہیں تو پھر سیلاب اور زلزلے جیسی آفتیں کیوں؟

سوال: اللہ اگر رحیم ورحمان ہے، تو پھر زلزلوں، سیلابوں اور وباؤں کے ذریعے لاکھوں جانیں کیوں تلف کردیتا ہے، اور اسی طرح فاقوں اور موسم کی سختیوں سے لوگوں کو کیوں مارتا ہے؟

جواب: اللہ بلا شبہ رحیم ورحمن ہے؛ لیکن اس کے ساتھ وہ قہار وجبار بھی ہے، جس طرح اس کی شانِ رحیمی کا اظہار ہوتا ہے، اسی طرح اس کی صفتِ قہاریت وجباریت کا بھی اظہار ہوتا ہے، یہ جو حوادث ہیں، یہ انھی صفات کے مظہر ہیں، ایسا بھی نہیں ہے کہ ان صفات کا اظہار بلا وجہ ہی ہوتا ہو؛ بل کہ یہ خدا کی نافرمانیوں کی وجہ سے آنے والی پریشانیاں ہیں، اور ان سب کی پہلے ہی پیشین گوئی کی جا چکی ہے، خود قرآن میں ہے کہ "جو بھی مصیبت تم پر آتی ہے وہ تمہارے اعمال کا ہی نتیجہ ہوتی ہے، پھر بھی خدائے تعالیٰ بہت سی چیزوں کو معاف فرما دیتے ہیں"۔ (الشوریٰ: ۳۰) اور احادیث میں تو ان کے متعلق مستقل ابواب ہیں، ہر گناہ کے اثر پر آنے والی مصیبتوں کا ذکر ہے، جیسے کہ ایک حدیث میں ہے: "جب زنا عام ہوگا تو زلزلے کثرت سے آئیں گے"، جو آج کل ہو رہا ہے، تو زلزلوں کی بھی کثرت ہے، اللہ ہم سب کی اپنے غضب سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

(منتخب فتاوی دار العلوم دیوبند، ۱/ ۸۷)

جب اللہ کی مرضی کے بغیر کوئی ایمان نہیں لاسکتا تو کافروں کا کیا قصور ہے؟

سوال: قرآن میں ہے کہ اللہ کی مرضی کے بغیر کوئی ایمان نہیں لاسکتا، تو پھر جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کا کیا قصور؟ پھر قرآن میں ہے کہ اللہ تم سے بھلائی کرنا چاہے، تو کوئی روک نہیں سکتا، اس کا مطلب ہے کہ سب اچھائی برائی اللہ کی مرضی سے ہوتی ہے؟

جواب: کسی کے ایمان نہ لانے کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے ہیں؛ لیکن کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے علم وارادے کے بغیر پائی بھی نہیں جاتی، یعنی: اللہ کو معلوم ہے کہ کون ایمان لائے گا، اور کون نہیں، ایمان لانے نہ لانے کے سلسلے میں بندے کو اختیار دیا گیا، اسے عقل دی گئی، اچھے راستے کی طرف اس کی راہ نمائی کی گئی، پھر بھی اگر بندہ

سیدھا راستہ نہ اختیار کرے، تو اس کا اپنا قصور ہے۔ (منتخب فتاوی دار العلوم دیو بند، ۱/۹۱)

قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا کیسا ہے؟

سوال: میں نے کچھ لوگوں سے سنا ہے کہ قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا جائز نہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ اگر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ لیں تو گناہ تو نہیں ہے؟

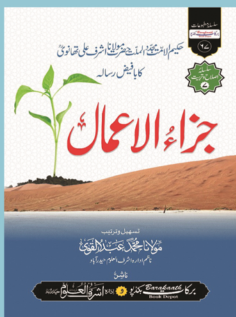
جواب: قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے میں حرج نہیں؛ البتہ دعا کرتے وقت رخ قبلے کی طرف کرے، نہ کہ قبر کی طرف؛ تا کہ استمداد کا شبہ نہ ہو، اور لوگوں کے عقیدے کی خرابی کا سبب نہ بنے۔

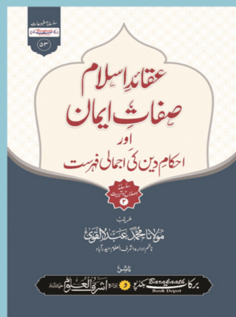
(فتاوی دار العلوم، ۱/۱۰۴)

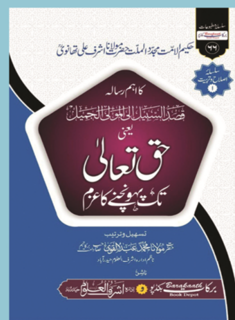
دورۂ حدیث کے لئے کسی مشہور مدرسہ جانے کا حکم

سوال: بعض طلباء کسی چھوٹے مدرسہ میں ابتداء سے ہدایہ یا مشکوۃ تک تعلیم حاصل کرتے ہیں، پھر موقوف علیہ یا دورۂ حدیث کے لئے کسی بڑے مدرسے میں کسی مشہور شخصیت کے پاس جاتے ہیں، تو سابقہ مدرسہ کے بعض اساتذہ یا مہتمم صاحب ان کو عاق گردانتے ہیں اور ناراض ہو جاتے ہیں، اس صورت میں طالبِ علم کے لئے جانا درست ہے یا نہیں؟

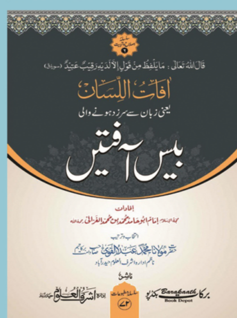
جواب: طالبِ علم کے لیے دوسرے مدرسہ جانا درست ہے اور یہ نافرمانی میں داخل نہیں ہے، درجِ ذیل چند وجوہات کی بنا پر: ۱۔ سابقہ اساتذہ یا مہتمم صاحب کا منع کرنا مشورہ کے درجہ میں ہے اور مشورہ کا قبول کرنا واجب نہیں ہے، یہ حکمِ شرعی نہیں ہے، جیسا کہ بخاری میں ہے کہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشورہ قبول نہیں فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناراض نہیں ہوئے۔ ۲۔ طالبِ علم کے لئے استاذ باپ کے درجہ میں ہے اور باپ کے ایسے حکم کو جس میں نہ باپ کو کوئی ضرر ہو نہ بیٹے کا کوئی نقصان ہو ماننا واجب نہیں ہے۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو منع کیا تھا کہ کمزور غلاموں پر مال خرچ نہ کرے؛ لیکن انہوں نے نہیں مانا، اور ہمیشہ خرچ فرمایا۔ ۳۔ فقہاء نے ایک مرشد کے بعد دوسرے مرشد سے بیعت کو جائز لکھا ہے، اگرچہ پہلا مرشد بہ ظاہر ناراض ہوتا ہوگا، لیکن اگر پہلا مدرسہ بہتر ہو یا دونوں برابر ہوں تو پھر استاذ کا حکم مان لیں اس میں برکت ہے۔ ۴۔ امام مسلمؒ اپنے استاذ امام محمد بن یحییٰ ذہلیؒ سے بعض وجوہات کی بنا پر ناراض ہو گئے تھے اور ان کی مرویات کو واپس کر دیا تو امام مسلم عاق نہیں ہوئے، تو اگر شاگرد، استاذ کی جگہ دوسرے معلم کو اختیار کر لے تو کیسے عاق شمار ہوگا؟ واللہ اعلم بالصواب (فتاویٰ دار العلوم زکریا، ۸/۴۸۸)

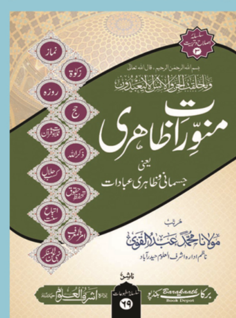


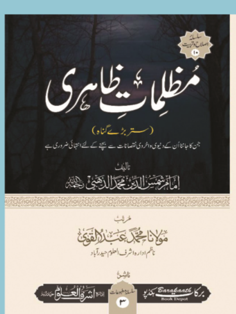


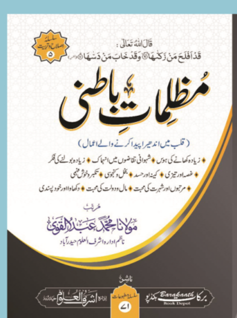


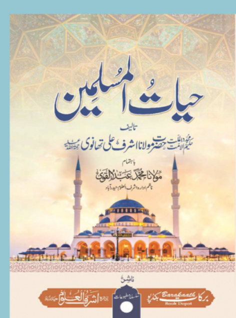












Printer, Publisher & Owner: Mohd Abdul Qavi, # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Published from: # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Editor : Mohammed Abdul Qavi